اردو کے مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش (نومبر)

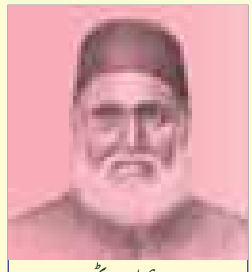
اسماعیل میرٹھی

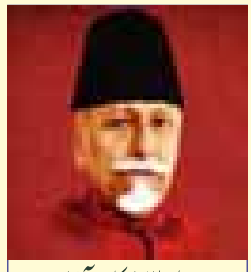
مولانا ابوالکلام آزاد

علامہ اقبال

یوسف ناظم

سجاد ظہیر

عمیق حنفی

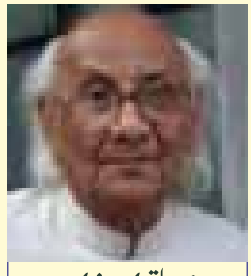
عبدالقوی دسنوی

علی سردار جعفری

پروین شاکر

کرشن چندر

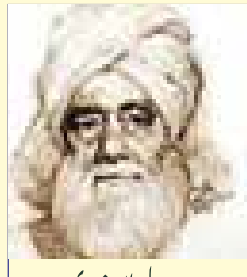
سید سلیمان ندوی

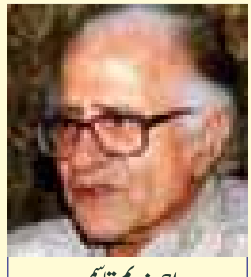
احمد ندیم قاسمی

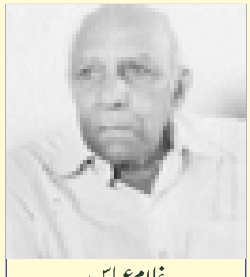
غلام عباس

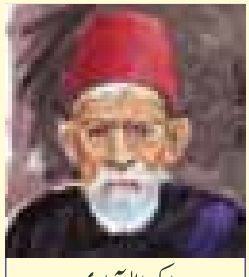
اکبرالہ آبادی

راجندر منچندا بانی

دلیپ بادل	یکم نومبر ۱۹۳۳ء	۱۳ر مارچ ۱۹۶۶ء
عبدالقوی دسنوی	یکم نومبر ۱۹۳۰ء	۷ر جولائی ۲۰۱۱ء
عمیق حنفی	۳ر نومبر ۱۹۲۸ء	۱۳ر اگست ۱۹۸۵ء
سلیم احمد	۳ر نومبر ۱۹۲۷ء	یکم ستمبر ۱۹۸۳ء
سجاد ظہیر	۵ر نومبر ۱۹۰۴ء	۱۳ر ستمبر ۱۹۷۳ء
مخمور دہلوی	۷ر نومبر ۱۹۰۰ء	۲ر فروری ۱۹۵۶ء
یوسف ناظم	۷ر نومبر ۱۹۲۱ء	۲۳ر جولائی ۲۰۰۹ء
علامہ اقبال	۹ر نومبر ۱۸۷۷ء	۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء
پریم وار برٹنی	۹ر نومبر ۱۹۳۰ء	۱۱ر اکتوبر ۱۹۷۹ء
احسن مارہروی	۹ر نومبر ۱۸۷۶ء	۳۰ر اگست ۱۹۴۰ء
ابوالکلام آزاد	۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء	۲۲ر فروری ۱۹۵۵ء

عزیز احمد	۱۱ر نومبر ۱۹۱۳ء	۱۶ر دسمبر ۱۹۷۸ء
اختر الایمان	۱۱ر نومبر ۱۹۱۵ء	۹ر مارچ ۱۹۹۶ء
رویندر کالیا	۱۱ر نومبر ۱۹۳۸ء	۹ر جنوری ۲۰۱۶ء
جمنا داس اختر	۱۲ر نومبر ۱۹۱۶ء	یکم ستمبر ۲۰۰۹ء
اسماعیل میرٹھی	۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء	یکم نومبر ۱۹۱۷ء
منچندہ بانی	۱۲ر نومبر ۱۹۳۲ء	۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۱ء
مختار الدین احمد	۱۴ر نومبر ۱۹۲۴ء	۳۰ر جون ۲۰۱۰ء
عنایت اللہ دہلوی	۱۵ر نومبر ۱۸۶۹ء	۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۳ء
احسن فاروقی	۱۵ر نومبر ۱۹۱۳ء	۲۶ر فروری ۱۹۷۸ء
اکبرالہ آبادی	۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء	۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء
مولوی عبدالحق	۱۶ر نومبر ۱۸۷۰ء	۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء

غلام عباس	۱۷ر نومبر ۱۹۰۹ء	۳ر نومبر ۱۹۸۲ء
جمیلہ ہاشمی	۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء	۱۰ر جنوری ۱۹۸۸ء
وحشت کلکتوی	۱۸ر نومبر ۱۸۸۱ء	۳۰ر جولائی ۱۹۵۶ء
احمد ندیم قاسمی	۲۰ر نومبر ۱۹۱۶ء	۱۰ر جولائی ۲۰۰۶ء
سید سلیمان ندوی	۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء	۲۳ر نومبر ۱۹۵۳ء
محمد احسن فاروقی	۲۲ر نومبر ۱۹۱۴ء	۲۶ر اپریل ۱۹۷۸ء
قتیل شفائی	۲۲ر نومبر ۱۹۱۹ء	۱۱ر جولائی ۲۰۰۱ء
کرشن چندر	۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء	۸ر مارچ ۱۹۷۷ء
پروین شاکر	۲۴ر نومبر ۱۹۵۲ء	۲۶ر دسمبر ۱۹۹۴ء
علی سردار جعفری	۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء	یکم اگست ۲۰۰۰ء
محمود ہاشمی	۲۹ر نومبر ۱۹۳۹ء	۲۲ر ستمبر ۲۰۰۹ء

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۲ شمارہ : ۸

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

نومبر ۲۰۱۷ء

پبلشر: انج کمار جھا
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

ایڈوائزر
ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

ایڈیٹر
سہیل وحید

فون: 9415007694
Ph. No. 2239132 Ext. 228

Email:
nayadaurmonthly@gmail.com

تزئین کار : وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش
زرِ سالانہ : ایک سو دس روپے
فی شمارہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001
Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعۂ رجسٹری:
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

عنوانات

اداریہ

اپنی بات ..... ایڈیٹر ۲

مضامین

زرد چہروں کی کتابیں ہیں کتنی مقبول ..... منور رانا ۳
کھاسی زبان اور اس کی مشہور لوک کتھائیں ..... ف۔س۔ اعجاز ۲۱

غیر ملکی ادب

عظیم مصنفین کی صف میں شامل ہو گئے کازوواشی گورو ..... خورشید احمد ۵
مجھے کبھی جانے نہ دینا ..... کازوواشی گورو ۱۰

گزشتہ لکھنؤ

خاندان اجتہاد اور سلطان المدارس ..... مرزا جعفر حسین ۳۵

ہندی کہانی

پردہ ..... یشپال ۳۹

ہندوستانی زبانیں

ایندھن (چھٹی قسط) ..... حمید دلوئی ۴۳

نظمیں اور غزلیں

احمد وصی ..... ۱۲ فوزیہ رباب ۱۳
رؤوف خیر ..... ۱۴ راشد جمال فاروقی ۱۴
ظفر مرزاپوری ..... ۱۵ راحت حسن ۱۵
عزیز نبیل ..... ۱۶ سید محمد سعید ۱۶
ایم ایچ تابش ردولوی ..... ۱۷ شاہد اختر ۱۷
ڈاکٹر عزیز خیر آبادی ..... ۱۸ شمس رمزی ۱۸
ڈاکٹر محمد زاہد ..... ۱۹ حسن رضا اطہر ۱۹
رضا امروہوی ..... ۲۰ ہاشم رضا جلالپوری ۲۰

نقد و تبصرے

اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار ... دیپک بدکی ..... ڈاکٹر ذکی طارق ۵۱
رامپور میں اردو مثنوی ..... ڈاکٹر جمیل دوشی ..... نجیب انصاری ۵۲

تاثرات

آپ کے خطوط ۵۵

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

اس سال ادب کا نوبل انعام جاپانی نژاد 'کازوواشی گورو' کو دئے جانے کا اعلان ہوا تو اسے بعض مغربی مفکرین نے Genuine Shock کہا۔ صرف مغرب ہی نہیں بلکہ ادب سے تعلق رکھنے والے دنیا کے تمام حصوں کے لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ گزشتہ برس جب باب ڈلن (Bob Dylan) کو جب ادب کا نوبل انعام دیا گیا تھا تو اکثر لوگوں نے صرف Shock لفظ کا استعمال کیا تھا۔ نوبل تو دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے، چھوٹے موٹے انعامات پر بھی چپقلش اور چہ می گوئیاں ہونا عام بات ہے لیکن ایک بات ہر سال ہم سب کو پریشان کرتی ہے کہ نوبل انعام دینے والی اکیڈمی کی نگاہیں صرف ترقی یافتہ مغربی ممالک اور امریکہ تک ہی محدود کیوں رہتی ہیں۔ کئی سوال بار بار ذہن میں آتے ہیں مثلاً جرمن زبان محض ۶ر کروڑ لوگوں کی زبان ہے اور اب تک اس کے چار ادیبوں اور شاعروں کو نوبل انعام حاصل ہو چکا ہے۔ اسی طرح فرنچ بولنے اور لکھنے والوں کی تعداد ۱۵ر کروڑ ہے اور فرنچ زبان کے سات ادیبوں اور شاعروں کو نوبل انعام سے نوازا جا چکا ہے۔ ہندوستان کی بات کریں تو ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق آٹھ کروڑ سے زیادہ لوگوں کی زبان بنگالی ہے، سات کروڑ ہندوستانیوں کی زبان تمل ہے۔ اردو بولنے اور لکھنے والوں کی تعداد چھ کروڑ سے زیادہ ہے۔ کئی مغربی ممالک ایسے ہیں جن کی زبان بنگالی، تمل، تیلگو، اردو اور مراٹھی بولنے والوں کی تعداد سے بہت کم ہے لیکن ان سب زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو ادب کے نوبل انعام حاصل ہو چکے ہیں جب کہ ہندوستان میں صرف بنگالی زبان کے عظیم شاعر رویندر ناتھ ٹیگور کو ہی ادب کا نوبل انعام حاصل ہو پایا۔ کیا باقی ہندوستانی زبانوں کا ادب کسی بھی ترقی یافتہ ملک کی زبانوں کے ادب سے کمتر ہے۔ انہیں مغربی ممالک اور امریکہ میں ہندی اور اردو کے ادبی شہ پاروں کے ترجمے بڑی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ ہندی اور اردو کے اساتذہ کا کلام جب سے آن لائن ہوا ہے، پوری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ 'مغل اعظم' سے لے کر نوے کی دہائی کے آخر تک ہندوستانی فلموں کے ہزاروں ایسے نغمے ہیں جنہیں عالمی پیمانے پر پذیرائی حاصل ہوئی لیکن کسی مغربی نقاد نے ان کو اس لائق نہیں سمجھا کہ وہ ان نغمہ نگاروں کی نوبل کے لئے سفارش کرتا۔

دوسری جانب مشہور نغمہ نگار گلزار اور موسیقار اے آر رحمان نے گزشتہ دنوں آسکر ایوارڈ حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ عالمی معیار پر ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔ جہاں تک ادب کی بات ہے، شاید ہندوستانی ادب ابھی تک تکنیک کا استعمال نہیں کر پا رہا ہے۔ مغربی ممالک اور امریکہ کے ادیب وشاعر اس امر میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ گلزار اور اے آر رحمان نے اسی طرز پر اپنے گیت اور موسیقی کو نامینیٹ کرا دیا تھا۔

لکھنؤ کی عزاداری سے منسوب اکتوبر ۲۰۱۷ء کے 'نیا دور' کو غیر متوقع طور پر زبردست پذیرائی حاصل ہوئی، جس نے دیکھا، اس نے پڑھنا چاہا اور پڑھا تو تعریف کئے بغیر نہ رہا۔ ہمیں مسلسل تعریفی وتوصیفی خطوط موصول ہو رہے ہیں اور فون آ رہے ہیں لیکن اسی شمارے میں غیر شعوری طور پر ایک غلطی بھی در آئی کہ قرۃ العین حیدر کا 'قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے' ان کے رپورتاژ 'کوہ دماوند' کا اقتباس کے طور پر چھپ گیا ہے۔ در اصل ایسا نہیں ہے۔ ہم پروفیسر شمیم حنفی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس جانب نشاندہی فرمائی۔

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

جلد ہی نیا دور کے اس سال کے تمام شمارے فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ کے لئے پوسٹ کئے جائیں گے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ فیس بک وال ادبی بحث مباحثوں کے لئے بھی حاضر ہے۔

ماہنامہ 'نیا دور' ہندوستان کا قدیم ادبی رسالہ ہے جو نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ادبی افق پر آفتاب کی طرح جلوہ گر ہے۔ یہ رسالہ ادبی دنیا اور علمی حلقہ میں اپنی منفرد شناخت قائم کر چکا ہے۔ اور ممتاز مقام کا حامل ہے۔ ماہنامہ 'نیا دور' مسلسل ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔ عظیم ادبی شخصیات پر شائع کئے گئے خصوصی نمبر بڑی اہمیت کے حامل ہیں جو وقت بہ وقت میرے زیر مطالعہ رہے ہیں۔

زیر نظر شمارہ جو ماہ محرم الحرام ۱۴۳۹ھ کی مناسبت سے شائع کیا گیا ہے، اپنے مندرجات کے حوالے سے اہم ہے۔ 'رثائی ادب' پر اہم مضامین شامل اشاعت کئے گئے ہیں۔ بزرگ قلمکاروں کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو جگہ دینا اشد ضروری ہے۔ نئی نسل کی فکری اور ذہنی آبیاری اسی طرح جاری رہی تو ہم اردو ادب کے مستقبل کے لئے پر امید ہیں۔

زیر نظر شمارہ کا ہر مضمون قابل مطالعہ ہے۔ منظومات معیاری اور اقتباسات کا حصہ قابل تعریف ہے۔ میں ماہنامہ 'نیا دور' کے تمام اراکین کے حق میں دعا گو ہوں کہ خدائے عز وجل آپ حضرات کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور جملہ اراکین اسی طرح ادب کی خدمات انجام دیتے رہیں۔ امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی ماہنامہ 'نیا دور' رثائی ادب پر قابل قدر نمبر شائع کرتا رہے گا۔

والسلام

(مولانا) سید کلب جواد نقوی

امام جمعہ، لکھنؤ

تاریخ: ۱۸ر اکتوبر

اتر پردیش کے گورنر عالیجناب رام نائک کا ادارہ 'نیا دور' ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے کہ انہوں نے ہمیں نہ صرف اپنا قیمتی وقت دیا بلکہ ستمبر کے شمارے کی رسم اجراء بھی انجام دی۔ اس موقع پر انہوں نے 'نیا دور' کی تعریف کی اور اسے پابندی سے شائع کرنے کی ہدایت بھی دی۔ ادارہ 'نیا دور' جناب انجم عباس نقوی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا بھی شکر گزار ہے کہ ان کی معاونت کے بغیر نہ تو گورنر صاحب کا انٹرویو ہو پاتا اور نہ ہی رسم اجراء انجام پاتی۔ اسی نسبت سے مشہور و معروف شاعر منور رانا صاحب نے خصوصی طور پر گورنر عالیجناب رام نائک کی تحریر کردہ کتاب 'چریویتی! چریویتی!' پر ایک مضمون 'نیا دور' کے لئے لکھا ہے جو اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ہم منور رانا صاحب کے بھی بیحد ممنون ہیں۔ اسی ضمن میں ۲۰۱۷ء میں ادب کے نوبل انعام سے نوازے گئے 'کازوواشی گورو' کے فن پر ایک مضمون اور ان کے ناول کے اقتباسات کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ اس صدی میں جن ادیبوں اور شاعروں کو ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا ہے ان کی تصویر اور تفصیل جرمن ویب سائٹ ڈاچے ویلے کے شکریہ کے ساتھ پیش ہے، ساتھ ہی ذاکر حسین کالج، دہلی کے پروفیسر پربھات رنجن صاحب کا بھی شکریہ کہ انہوں نے ہمیں کازوواشی گورو کے ناول کے اقتباس کا ہندی ترجمہ مہیا کرایا جس کا اردو ترجمہ پیش ہے نیز شمارے کے سرورق پر شائع کازوواشی گورو کی تصویر کے لئے ہم The Wire کے بھی ممنون ہیں۔ ماہنامہ 'انشاء' کے مدیر جناب ف۔س۔ اعجاز کا شکریہ نہ ادا کرنا ناانصافی ہوگی کہ انہوں نے شمال جنوب میں بولی جانے والی کھاسی زبان کی لوک کتھاؤں کا اردو ترجمہ مع تعارف ارسال کیا ہے۔

جلد ہی 'نیا دور' عالمی سطح پڑھا جانے لگے گا کیونکہ اس کے ای ایڈیشن کو www.information.up.nic.in پر ہر مہینے اپلوڈ کئے جانے کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ قوی امکان ہے کہ دسمبر سے ہر مہینے نیا دور ویب سائٹ پر مطالعہ کے لئے موجود رہے گا۔

سہیل وحید

زرد چہروں کی کتابیں بھی ہیں کتنی مقبول

منور رانا
UGF-1، ڈھینگرا اپارٹمنٹ، لال کنواں لکھنؤ
موبائل: 9839050450

جب کسی شخصیت میں قلندری کی کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں، تو روشنی کے امکانات بڑھنے لگتے ہیں، جب صوبے کی سب سے بڑی شخصیت کے لہجے، گفتگو اور سوچ میں خاکساری بھی شامل ہو جاتی ہے تو عام آدمی بھی اپنے آپ کو سرخرو محسوس کرنے لگتا ہے۔

محترم رام نائک اگر سیاست میں نہ ہوتے تو یقینا بہت اچھے ساہتیہ کار ہوتے، حالانکہ انہوں نے سیاست کی ہنگامے بھری زندگی گذارنے کے باوجود اپنے قلم کی روشنائی کو کبھی خشک نہیں ہونے دیا، شاید انہیں ایک زندہ دل انسان کیطرح زندہ رہنے کا شوق ہے، اس لئے تو انہوں نے اپنی کینسر کی بیماری کو بھی ہنستے کھیلتے ہوئے برداشت کیا، کینسر جیسی زہر آلود بیماری کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو خدمت خلق اور صحافت کی خدمت سے الگ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ایسی بیماری میں گھرے لوگوں کے درمیان اور ان کی خدمت میں گذارا، جن لوگوں کے پاس سے بڑے بڑے مذہبی اور سماجی لوگ بھی نہیں گذرتے ہیں، کاش ہماری ہندوستانی سیاست میں رام نائک صاحب جیسے سو (100) دوسو (200) لوگ پیدا ہو جاتے تو اس ملک میں دوا اور غذا کے بغیر مرنے والوں کی تعداد نہیں کے برابر ہو جاتی۔

میری بیماری کے دوران اچانک گورنر صاحب میری عیادت کے لئے PGI تشریف لائے، حالانکہ نہ میں اتنی بڑی شخصیت تھا، نہ میری پہلے سے گورنر صاحب سے کوئی قربت یا نزدیکی تھی، اس طرح ان کا مجھے اسپتال میں دیکھنے آنا، میرا حوصلہ بڑھانا، میرے گھر کے لوگوں کو تسلی دینا، ایک خوشگوار پہلو تھا، لیکن ان کی اس طرح اچانک آمد نے مجھے ایک سبق ضرور دیا کہ اپنے عہدے کی سیڑھیوں سے اتر کر بیمار یا پریشان حال لوگوں کی عیادت کرنا دنیا کی سب سے بڑی عبادت ہے۔

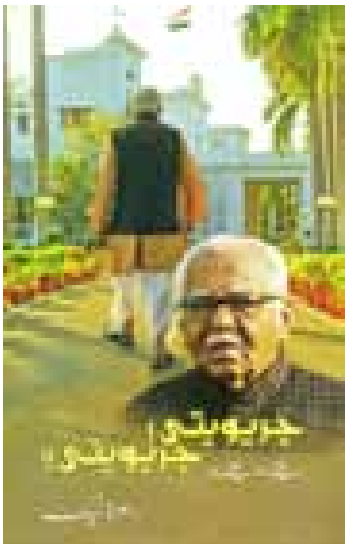

اسپتال سے رخصت ہوتے وقت گورنر صاحب نے مجھے اپنی تحریر کردہ آپ بیتی ''چریویتی - چریویتی'' کتاب کے اردو ایڈیشن سے نوازا۔

بیماری کے موسم یا تنہائی کے زمانے میں کتاب ہی دوا اور دوست جیسے لگتے ہیں، یوں بھی مجھے آپ بیتی کے صحرا میں گھومنے کا بہت شوق ہے، میں نے مختلف زبانوں میں لکھی گئی آپ بیتیوں کی درجنوں کتابیں ترجمے کی مدد سے پڑھی ہیں، یوں تو میں ترجمے کو عام طور سے کشمیری شال کا الٹا حصّہ سمجھتا ہوں، کیونکہ ترجمے کی مدد سے پڑھی جانے والی اکثر کتابیں جذبے کی صداقت سے محروم رہتی ہیں، لیکن محدود زبان کی لیاقت کے سبب ترجمے پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

میں نے گورنر صاحب کی آپ بیتی کا مطالعہ پورے ذوق وشوق سے کرنا شروع کیا، حالانکہ کئی دنوں تک وینٹی لیٹر پر پڑے رہنے کی وجہ سے میں کافی نقاہت محسوس کر رہا تھا، لیکن جیسے جیسے عباس رضا نیّر کے ترجمے کے سہارے میں گورنر صاحب کی زندگی کے گہرے کنوئیں میں اتر رہا تھا، مجھے اپنے اندر ایک عجیب سی توانائی سی محسوس ہوتی جا رہی تھی، کتاب کیا تھی دکھ سکھ کے تانے بانے سے بُنا ہوا ایک دوشالہ تھی جو اتر پردیش کے گورنر کے کاندھوں سے لپٹی ہوئی تھی، اور وہ اپنے بیتے دنوں کی کہانی اپنی پھیکی مسکراہٹ کے سہارے سنا رہے تھے۔

کتاب کیا تھی ایک ایسا پیڑ تھی جس کی کئی شاخوں پر پیلے پیلے پتے موسم بہار کا مذاق اُڑا رہے تھے، لیکن یہ آپ بیتی کی خوش نصیبی تھی کہ جہاں جہاں شاخوں کے پتّے پیلا پن لئے ہوئے تھے، وہاں وہاں پر بچوں کے ہاتھوں سے چھوٹی ہوئی پتنگیں شاخوں کو ہرا رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں، میری ایک عجیب وغریب یا دلچسپ عادت یہ ہے کہ اگر مجھے کوئی کتاب پڑھتے ہوئے اچھی لگنے لگتی ہے تو میں اُسے محبوب کے خط کیطرح بہت دھیان سے پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں،

بلکہ اچھی لگنے والی کتاب کو میں اپنے ذہن کے کسی خانے میں قید کرنے کی کوشش کرتا ہوں، شاید اس طرح میں اپنی اصلاح کی کوشش ہی نہیں کرتا، بلکہ اپنے علم میں اضافہ بھی کرلیتا ہوں۔

کسی بھی کتاب کو پڑھتے ہوئے اگر مصنف کے احترام سے زیادہ اُس سے محبت بڑھ جائے تو میرے خیال سے وہ ایک کامیاب تحریر ہے، اور میں پوری ایمانداری سے یہ عرض کرنا اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں کہ رام نائکؔ صاحب کی کتاب ''چریویتی-چریویتی'' پڑھتے ہوئے مجھے کئی بار اپنی آنکھوں کے سامنے سے آنسوؤں کا ڈھیر ہٹانا پڑا۔ کبھی کبھی تو آنسو اتنے گرم ہوتے تھے کہ میری انگلیاں انھیں تیزاب جیسا محسوس کررہی تھیں۔

زندگی کے اچھے بُرے دنوں کو یاد رکھنا اگر عبادت نہیں ہے تو عبادت سے کم بھی نہیں! ماضی کے زخموں کو کریدنا پھر انہیں ہو بہو کاغذ پر اتارنا بہت دشوار کام ہے۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں اپنے والد کو مٹی کی چادر اوڑھا کر زندگی کی جنگ پرتنِ تنہا چل دینا، عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ جلتے بجھتے یادوں کے چراغ سے زندگی میں اتنا اجالا کردینا کہ دنیا رشک کی نگاہ سے دیکھے یہ بھی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اپنی کہانی میں دوسرے کرداروں کو شامل کرنا، انہیں پورے سمّان کے ساتھ اپنی کہانی میں زندہ رکھنے کو ہی میں سچّی آتم کتھا سمجھتا ہوں، وہ ریلوے کے وزیر بھی تھے، لیکن زندگی کو ہندوستانی ریل گاڑی کی طرح درشایا ہے، جس طرح ریل گاڑی میں ہندوستان کی امیری اور غریبی یکساں سفر کرتی ہے، اسی طرح ان کی کتاب ''چلتے رہو- چلتے رہو'' میں بھی دکھ اور سکھ نے ایک ساتھ سفر کیا ہے۔ رام نائک صاحب کی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ ریلوے وزیر نظر آتا ہے نہ پٹرولیم منسٹر، اس کتاب میں تو ایک ایسا غریب پرور دوست ساتھی اور ہم سفر مسلسل دکھائی دیتا ہے، جو کوڑھ زدہ جسم اور نصیب سے پریشان انسانوں کے ساتھ انسانی ہمدردی کے ناطے ساتھ ساتھ چلتا نظر آتا ہے، وہ غریب مچھواروں کی ڈولتی ہوئی ناؤ اور ڈوبتی ہوئی کشتی میں اپنے آپ کو موجود رکھنا چاہتا ہے۔

رام نائک صاحب کی کتاب میں ماں بھوانی کا خط اندھیارے میں جگنو کی طرح چمکتا محسوس ہوتا ہے۔ وہ اتر پردیش کے گورنر ہونے کے باوجود اخبار کے ہاکر میں اپنی رشتے داری تلاش کرلیتے ہیں۔ جس ممبئی سے وہ اپنے پتا شری کا مردہ جسم اٹھا کر اپنے گاؤں کی اور لوٹے تھے، لیکن ہندوستان کے لاکھوں

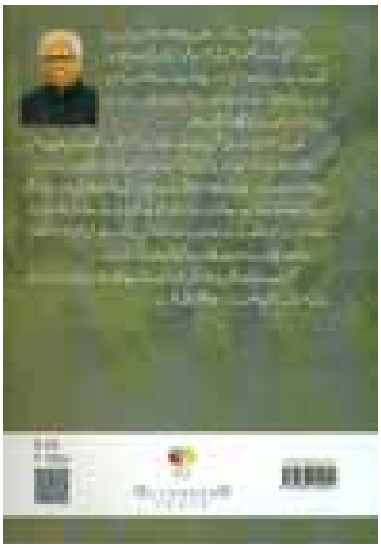

بے گھروں کو پناہ دینے والے ممبئی شہر کی طرف وہ اپنے رزق کا حصّہ لینے کے لئے دوبارہ لوٹے، جس ممبئی سے وہ ایک معمولی اسکول ہیڈ ماسٹر کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر پُونے واپس ہوئے تھے، اسی ممبئی کو اپنی محنت، شرافت، خاکساری، رواداری اور انکساری کی بدولت ایک مرکزی وزیر دیا، اسی ممبئی شہر کی خاک کو سرخرو کرنے کے لئے وہ دنیا کے سب زیادہ نازک مزاج نفاست پسند اور شبنمی گفتگو والے شہر لکھنؤ کے میزبان اور مہمان بنے۔

اپنے پتا شری کے دوست سورگ باسی پربھاکر جوشی کی پتنی اوما چاچی سے یہ تربیت حاصل کرنے کے لئے کہ ''ممبئی'' میں چائے پینے کی عادت ڈال لو، یہاں ہر کوئی تمہیں دودھ تھوڑی دے سکتا ہے اوما چاچی کا یہ معمولی سا جملہ مراٹھواڑہ کی ہزاروں برس کی مہمان نوازی اور غریب پروری کی تصدیق کرتا دکھائی دیتا ہے۔ شاید اسی گھر سے رام نائک صاحب نے وزیروں میں وزیر اور فقیروں میں فقیر بنکر رہنا سیکھ لیا تھا۔ انیس (19) برس کی بھولی بھالی عمر میں یہ طے کرلینا کہ ''پیڑ میٹھا ہو تو اس کی جڑیں نہیں کھائی جاتیں'' ان کی اسی سوچ نے ان کے روشن مستقبل اُن کے اور ہندوستان کی بڑی شخصیت ہونے کا اعلان کردیا۔

یوں بھی تہذیب کے شہر لکھنؤ کا گورنر ہونا ہندوستان کا بہت بڑا اعزاز ہے، اپنے حسنِ کلام شائستگی، اور شرافت کی بنا پر لکھنؤ جیسے خود پرست شہر کے حضرات وخواتین میں ہر دلعزیز ہوجانا کسی بھی شخصیت کے لئے دنیا کا سب سے بڑا تحفہ ہے، ہاں ان کے لئے یہ ایک تکلیف دہ عمل ہے کہ اس عمر میں انہیں لکھنؤ اور ممبئی دونوں سے عشق کی رسم وراہ نبھانا پڑ رہی ہے، راج بھون کے خواب میں وہ ''شیوا سمرتی'' کی تعبیر دیکھتے ہیں اور جب ممبئی جاتے ہیں تو اپنے گھر شیوا سمرتی کے خواب میں وہ لکھنؤ دیکھتے ہیں۔

پٹرولیم کی وزارت کے زمانے میں عراق کے مشہور ہوٹل الرشید کے فرش پر جارج بش کی فرش پر بنی ہوئی تصویر کے اوپر سے رام نائک صاحب کا گذرتے وقت جھجکنا نہ صرف یہ کہ انہیں ایک سچا ہندوستانی ثابت کرتا ہے، بلکہ وہ انسانیت کے اس پیروکار کیطرح نظر آرہے ہیں، جس کا احترام دنیا کا ہر مذہب کرتا ہے اور شائد خدا سچی محبت بھی ایسے ہی لوگوں سے کرتا ہوگا۔

زرد چہروں کی کتابیں بھی ہیں کتنی مقبول
ترجمے ان کے جہاں بھر کی زبانوں میں ملے

❑❑❑

عظیم مصنفین کی صف میں شامل ہو گئے کازوواشی گورو

خورشید احمد
161/8، سیکٹر ۸، اندرانگر، لکھنؤ
موبائل: 9838908601

''میں مشکل سے جب نو یا دس سال کا تھا تب ''شرلاک ہومس''(Sherlock Holmes)اور''ایس جے واٹسن''(S.J. Watson) کی تخلیقات کو پڑھنے کا مجھ پر ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا، حدتو یہ ہے کہ انہیں دونوں ادیبوں کی تخلیقات کے کرداروں کے برتاؤ اور طور طریقوں کو میں نے اپنی زندگی میں اتار لیا تھا اور انہیں کی طرح برتاؤ کرنے لگا تھا۔ میں لوگوں سے واحد متکلم میں گفتگو کرتا، اور ان ہی کے لکھے ہوئے مکالمہ اور جملے بولتا، میرے اندر آئی اس تبدیلی کو دیکھ کر لوگ میرے جاپانی نژاد ہونے کا مذاق اڑاتے۔'

یہ اقتباس اس سال ادب کے نوبل انعام سے سرفراز جاپانی نژاد انگریزی ادیب' کازوواشی گورو' کا ہے۔ ۲۰۱۷ء کے نوبل انعام برائے ادب سے نوازے جانے کے بعد انہوں نے اپنے ابتدائی ادبی سفر کی شروعات کے بارے میں وہ اس طرح گویا ہوئے۔ ان پر بچپن میں ہی شرلاک ہومس اور واٹسن جیسے عالمی پیمانے پر مقبول و مشہور ادیبوں کا زبردست اثر ہو گیا تھا۔ جب ان کی عمر پانچ سال تھی ان کا خاندان اس وقت برطانیہ میں آ کر مقیم ہو گیا تھا۔ سن 1978 میں کینٹ یونیورسٹی سے گریجوشن کی ڈگری حاصل کی اور وہیں سے انگریزی اور فلسفے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد، فکشن نگاری کے تمام رموز و نکات اور اس کی تکنیک کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے نثری تخلیقیت میں ''ماسٹر آف آرٹس'' کی ڈگری حاصل کی۔ دوران طالب علمی ہی انہیں ''میلکم بیڈبری'' اور ''اینجلا کارٹر'' جیسے ادیبوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ یہ دوران کی تخلیقی زندگی کے لئے بیحد اہم ثابت ہوا اور ان کی نثری تخلیقات کو توجہ حاصل ہونے لگی۔ یہی وہ دور تھا جب انہیں برطانیہ کے چھوٹے بڑے تمام ادباء اور شعراء کے درمیان پہچانا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی ایک الگ شناخت قائم کر لی اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ 1983 میں انہیں ''گرانٹ میگزین'' کی نوجوان برطانوی مصنفین کی فہرست شامل کر لیا گیا۔

SVENSKA AKADEMIEN

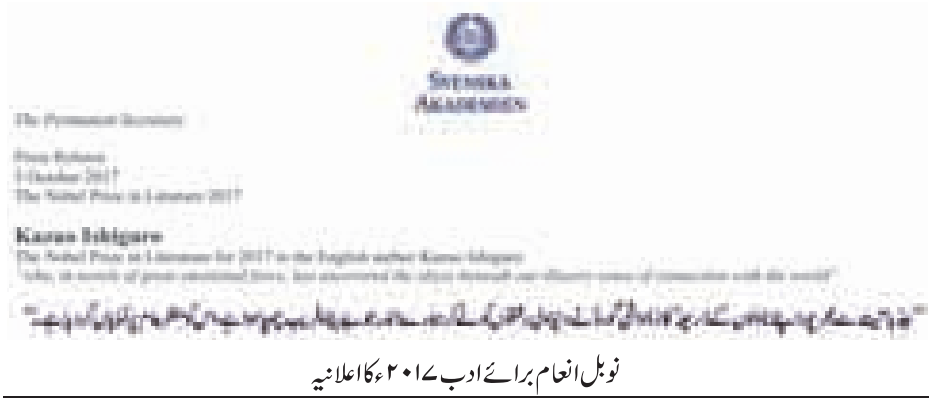

Kazuo Ishiguro

نوبل انعام برائے ادب ۲۰۱۷ء کا اعلانیہ

حالانکہ گرانٹ میگزین کی فہرست میں شامل ہونے سے پہلے ہی 1982 میں' کازوواشی گورو' کا پہلا ناول (A Pale View of Hills) شائع ہو چکا تھا۔ اس ناول کے منظر عام پر آنے کے بعد برطانیہ ہی نہیں بلکہ کئی مغربی ممالک کے کئی معتبر انگریزی مصنفین نے انہیں بطور ادیب اہمیت دینا شروع کر دی تھی۔' کازوواشی گورو' کے اس ناول کا مرکزی کردار انگلینڈ میں مقیم ایک خاتون' کیکو' تھی جس نے ایک جاپانی نژاد شخص سے شادی کی تھی۔ ان دونوں کی ایک بیٹی تھی۔ ان دونوں نے جاپان سے ہجرت کر کے برطانیہ

کوائف ذات: ایک نظر میں

پیدائش	8 نومبر 1954۔ ناگاساکی، جاپان
پیشہ اور مشاغل	ناول نگاری، افسانہ نگاری، اسکرین پلے رائٹر، کالم نویس، نغمہ نگار
تعلیم	بی اے، انگریزی، فلسفہ، یونیورسٹی آف کینٹ، 1978۔ برطانیہ، ایم اے، تخلیقی تحریریں، یونیورسٹی آف ایسٹ اینجلا، برطانیہ
اصناف	ڈرامہ اور تاریخی فکشن
ازدواجی حیثیت	1986 میں لورا میگرڈ وگل سے شادی۔ ایک بیٹی 'نومی' ہے۔

میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کی ملاقات ایک برطانوی شخص سے ہوئی اور جلد ہی وہ دونوں ساتھ رہنے لگے۔ ان دونوں کی بھی ایک بیٹی ہوئی جس کے نام کو لے کر دونوں کے درمیان کافی دنوں تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا اور آخر کار انہوں نے اپنی پہلی بیٹی کے نام پر ہی اس کا نام بھی 'نکی' رکھ دیا جو اپنے خد و خال، بالوں کے رنگ، بولی اور زبان اور آنکھوں سے بہت کم جاپانی نظر آتی تھی۔ ان تینوں کی زندگی کم و بیش کسی طرح گزرتی رہی۔ اپنی بیٹی کے لئے انہوں نے ہر سہولت مہیا کرائی لیکن وقت کی نزاکت اور برطانوی سماج کا جاپانیوں کے تئیں جو رویہ موجود تھا، اس کی وجہ سے ایک دن 'کیکو' خودکشی کر لیتی ہے۔ 'کازوو اشی گورو' نے اس ناول میں غیر ملکیوں بالخصوص جاپانی نژاد مہاجرین کے تئیں برطانوی سماج کے رویوں کی زبردست عکاسی کی ہے۔

جب اگست 1945 میں جاپان کے شہر ''ہیروشیما اور ناگا ساکی'' کو امریکی ایٹمی بموں نے اپنا ہدف بنایا تو یہ تاریخ کا ایک ایسا دردناک المیہ تھا، جسے آج بھی دنیا کی تاریخ کا ایک سیاہ باب تصور کیا جاتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والے بحران اور انسانوں کا زیاں بہت ہی اذیت ناک صورت حال سے عبارت ہے۔ 'کازوو اشی گورو' نے اس پورے واقعہ کو برطانوی درسی کتاب میں بڑی تفصیل سے پڑھا تھا۔ ان شہروں کے خاتمے اور تباہ کاریوں کے دلدوز سانحہ کا تذکرہ بھی انہوں نے اس ناول میں خوب کیا ہے۔

یہ ناول ایک ایسی حقیقت پر مبنی

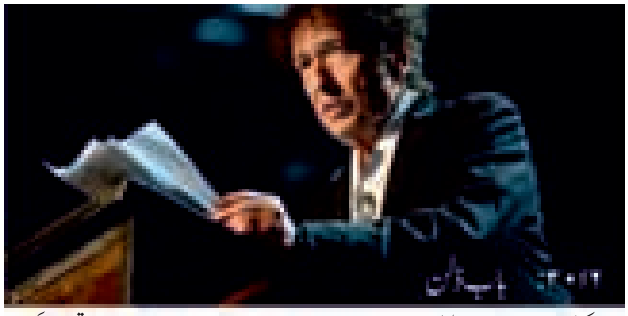

امریکی نغمہ نگار اور ادیب باب ڈلن کو رواں برس کے نوبل انعام برائے ادب سے نوازا گیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی گیت نگار کو ادب کا یہ اعلیٰ ترین انعام دیا گیا ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، اداکار اور مصنف ہونے کے علاوہ ساز نواز بھی ہیں۔ انہوں نے کئی فلموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔

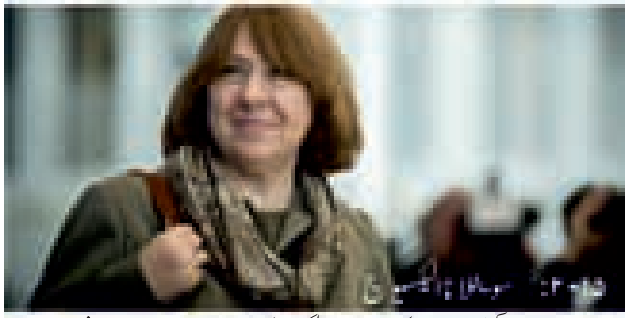

نوبل انعام دینے والی کمیٹی نے بیلاروس کی مصنفہ سویتلانا الیکسیوچ کو ادب نگاری کے ایک نئے عہد کا سرخیل قرار دیا۔ کمیٹی کے مطابق الیکسیوچ نے اپنے مضامین اور رپورٹوں کے لیے ایک نیا اسلوب متعارف کرایا اور انہوں نے مختلف انٹرویوز اور رپورٹوں کو روزمرہ کی جذباتیت سے نوازا ہے۔

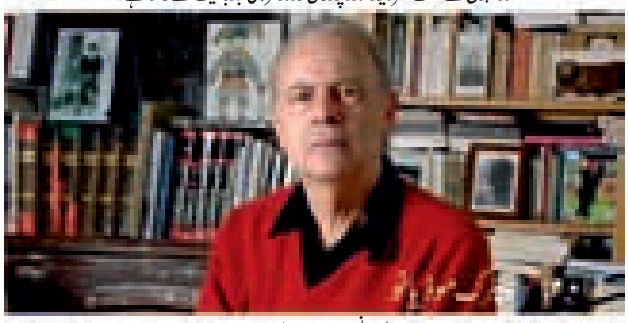

جنگ، محبت، روزگار اور موت جیسے موضوعات کو فرانسیسی ادیب پیٹرک موڈیانو نے اپنے تحریروں میں سمویا ہے۔ نوبل کمیٹی کے مطابق انہوں نے اپنے ناآسودہ بچپن کی جنگ سے عبارت یادوں کی تسلی و تشفی کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا اور یادوں کو الفاظ کا روپ دینے کا یہ منفرد انداز ہے۔

تین برس قبل کناڈا کی ادیبہ ایلس مُنرو کو ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔ نوبل انعام دینے والی کمیٹی نے اُن کو عصری ادب کی ممتاز ترین ادیبہ قرار دیا۔ منرو سے قبل کے ادیبوں نے ادب کی معروف اصناف کو اپنی تحریروں کے لئے استعمال کیا تھا لیکن وہ منفرد ہیں۔

ہے، جس کا براہ راست تعلق ہر انسان کے احساس سے عبارت ہے۔ یہ پورا ناول ایک تاریخی حقائق کی ایسی دستاویز ہے، جو افسانوی طرز اسلوب میں ہونے کے باوجود ایک ایسی سفاک حقیقت کی عکاسی کرتا ہے جس کا براہ راست تعلق کہیں نہ کہیں ہمارے سماج سے ہی ارتباط و انسلاک رکھتا ہے اور اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں پائی جانے والی جمالیاتی حس اپنے افسانوی بیانیہ کے ساتھ اپنے قارئین پر بڑے واضح طور سے منکشف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول مجموعی طور سے اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتا ہے اور اس کی معنوی کائنات کی مختلف جہات روشن ہوجاتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ ناول اپنے اسلوبی منہاجیات کا ایک بہترین پیرایہ اظہار بھی ہے جو اپنے اسلوبیاتی سطح پر بھی دیگر ناولوں سے قدرے مختلف ہے۔ اس ناول کی یہی انفرادیت اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ یہ ناول ایک خاص موضوع سے منسلک ہونے کے باوجود اپنے افسانوی رنگ میں بھی اپنی بھرپور حساسیت کا مظہر ہے جو اس ناول میں موجود اپنے مختلف کرداروں کی ساخت و پرداخت کے اعتبار سے جدا ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت ہی مربوط و منضبط نظر آتے ہیں۔ مصنف نے اپنی بھرپور خلاقانہ بصیرت اور ماہرانہ تخلیقی جوہر اور اپنی منفرد تکنیک کے ساتھ اس کے تمام تر تلازمات اور اس کے معنوی امکان کے آفاق کو اس ناول میں سمو دیا ہے۔ جس میں فکشن نگار کی ذاتی زندگی کی واردات اور ان سے وابستہ افراد کے نفسیاتی عمل کو اپنی فکر

میں تحلیل کرکے اسے لفظوں سے ایسی پیکرتراشی کی ہے کہ جسے پڑھ کر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ خاص کر ان افراد کے لئے جو ہجرت کے کرب سے گزر چکے ہیں۔'کازوواشی گورو' کو اس بات کا احساس ہے کہ ہجرت انسان کی زندگی کا کتنا المناک مرحلہ ہوتا ہے کہ نقل مکانی کرنے والے افراد اپنے ساتھ رونما ہونے والے اس المیہ کو کبھی فراموش نہیں کر پاتے اور اس المیہ کا ردعمل اکثر بڑی جانکاہی اور جگر کوہی سے عبارت ہوتا ہے۔غریب الوطنی کا شکار شخص اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے وطن سے بچھڑنے کے غم کا مداوا چاہتا رہتا ہے لیکن اُسے اس کا ماحصل سوائے اداسی ،تنہائی و اجنبیت کے اور کچھ نہیں ملتا۔ یہی وہ تمام تر علائم ہیں جن کو مصنف نے بڑی فنی چابکدستی کے ساتھ اپنے اس ناول میں بیان کیا ہے جو اس ناول کا اصل جوہر ہے۔

اس کے بعد ان کا ایک اور ناول منظر عام پر آیا جس کا نام تھا۔(An Artist of the Flooting World) جو ایک جاپانی پینٹر کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا اور اس کے پلاٹ کا اصل پس منظر دوسری عالمی جنگ میں ہونے والی انسانی تباہ کاریوں سے تعلق رکھتا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار ایک عمر رسیدہ پینٹر ہے جس کی زبان سے دوسری عالمی جنگ کی تباہکاریوں کے اندوہناک قصے بیان کئے گئے ہیں۔

اس ناول کے منظر عام پر آنے کے بعد 'کازوواشی گورو' کی ادبی خدمات کو ایک انفرادی شناخت ملی ۔اس ناول کے شائع

چینی ادیب گوان موئے کا قلمی نام مویان ہے۔انہیں چینی زبان کا کافکا بھی قرار دیا جاتا ہے۔نوبل انعام دینے والی کمیٹی کے مطابق مویان نے اپنی تحریروں میں حقیقت کے قریب تر فریبِ خیال کو رومان پر ورداستان کے انداز میں بیان کیا ہے۔ چینی ادیب کی کمیونسٹ حکومت سے قربت کی وجہ سے چینی آرٹسٹ ائی وی وی نے اِس فیصلے پر تنقید کی تھی۔

سویڈش شاعرٹرانسٹرُ ومر کے لیے ادب کے نوبل انعام کا اعلان کرتے ہوئے کہا گیا کہ اُن کی شاعری کے مطالعہ کے دوران الفاظ میں مخفی جگمگاتے مناظر بتدریج حقیقت نگاری کا عکس بن جاتے ہیں۔ ٹوماس گوسٹا ٹرانسٹرُ ومر کی شاعری ساٹھ سے زائد زبانوں میں ترجمہ کی جا چکی ہے۔

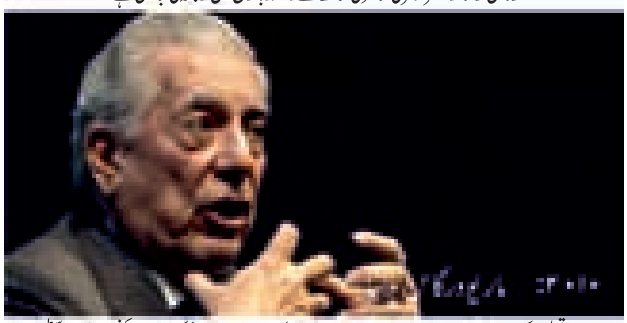

پیرو سے تعلق رکھنے والے ہسپانوی زبان کے ادیب ماریو ورگاس یوسا کو اقتدار کے ڈھانچے کی پرزور منظر کشی اور انفرادی سطح پر مزاحمت، بغاوت وشکست سے دوچار ہونے والے افراد کی شاندار کردار نگاری پر ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔انھوں نے لاطینی امریکا کے کئی حقیقی واقعات کو اپنے ناولوں میں سمویا ہے۔میکسیکو کی آمریت پر مبنی اُنکی تخلیق کی بہت زیادہ پذیرائی ہوئی تھی۔

نوبل انعام دینے والی کمیٹی کے مطابق ہیرٹا میؤلر نے اپنی شاعری اور نثری فن پاروں میں بے گھر افراد کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ ایسے افراد کے درد کا اظہار ہے۔جیوری کے مطابق جرمن زبان میں لکھنے والی مصنفہ نے رومانیہ کے ڈکٹیٹر چاؤ شیسکو کو زوردار انداز میں ہدفِ تنقید بنایا تھا۔اُن کا ایک ناول Atemschaukel کا پچاس سے زائد زبانوں میں ترجمہ کیا جاچکا ہے۔

ہونے کے بعد انگریزی ادب کے کچھ ناقدین نے کہا کہ 'کازوواشی گورو' نے اپنی تحریروں کے ذریعہ انسانی جذبات کی عکاسی بڑی ہنرمندی کے ساتھ کی ہے۔انھوں نے نثری تخلیقیت میں پیدا ہونے والی انجمادی کیفیت کو توڑ کر اسے ایک نئے رجحان سے آراستہ کیا۔ان کا ایک اور ناول (Where we were Orflans) ہے جسے جاسوسی ناول کے طور پر جانا جاتا ہے۔اس ناول نے بھی قارئین کے درمیان کافی مقبولیت حاصل کی۔اس ناول کے منظر عام پر آنے تک 'کازوواشی گورو' پورے انگریزی ادب میں بطور ناول نگار سند حاصل کر چکے تھے۔

اس کے بعد آتا ہے نوے کی دہائی کا وہ دور جو 'کازوواشی گورو' کو ان کی ادبی معراج تک لے جاتا ہے۔ یہ وہی دور تھا جب انہوں نے ایک شاہکار ناول (Never Let me Go) تخلیق کیا۔اس ناول کے منظر عام پر آنے کے بعد ان کی شہرت مغربی ممالک کی سرحدوں کو پار کرکے پوری دنیا میں پہنچ گئی۔انہیں عالمی سطح پر ایک کامیاب ناول نگار تسلیم کیا جانے لگا۔تمام انگریزی نقادوں نے اپنی رائے اظہار کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ 'کازوواشی گورو' کا یہ ناول مستقبل کے سائنس فکشن میں ایک تجرباتی کنٹری بیوشن ہے۔اس ناول کے آنے اور شہرت کی بلندیاں چھونے کے بعد 'کازوواشی گورو' نے پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔حالانکہ اس سے پہلے 1989 میں ان کے ایک اور مشہور ناول (The Remains Of

The Day) کو ''بہترین کتاب'' کے اعزاز سے پہلے ہی نوازا جاچکا تھا۔'کازوو وایشی گورو' نے اس ناول میں اپنے موجودہ سماج میں پائی جانے والی منفی قوتوں کے زیر اثر پیدا ہونے والے اخلاقی بحران اور انسانی اقدار کے زوال کی بھرپور عکاسی کی ہے اور اس فرسودہ نظام کی کھل کر بغاوت بھی کی ہے جو ہماری معاشرتی زندگی میں انسانوں کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا کردیتا ہے، جسے پُر کرنا شاید ناممکن ہوتا ہے۔ انہوں نے انسانوں پر مسلط کیے جانے والے جابرانہ نظام کی ان پیچیدگیوں کی نا سلجھنے والی گتھیوں کو سلجھانے کے ساتھ ساتھ ایک مثبت طرز زندگی کے نظریئے کو اس ناول میں بدرجۂ اتم پیش کیا ہے جو ہماری تہذیبی معاشرت میں غیر شعوری طور پر در آنے والی مختلف تہذیبوں کی جدلیاتی یلغار کو کیسے روکا جائے، اس پر منحصر ہے۔ وہ کون سی مثبت اور صحت مند فکر ہے جس کے فروغ سے ہم اپنے عالمی سماج میں عدم توازن کے شکار اخلاقی اقدار کو پھر سے بحال کرسکتے ہیں۔

'کازوو وایشی گورو' انہیں مسائل کو اپنے اس ناول میں سمودیا ہے۔ اس ناول کا اساسی نکتہ اپنے تمام لفظی تلازمات اور معنوی نہج کے ساتھ اپنے موضوع اور متن سے بڑی ہماہنگی رکھتا ہے۔ یہی نہیں اس ناول میں انسان اور دنیا کے مابین ازل سے پائے جانے والے ان رشتوں کو بھی واشگاف کیا گیاہے جو محض اساطیری واقعات پر ہی مبنی نہیں ہیں بلکہ اس کے حقائق کے اندرون میں پوشیدہ اسرار کو بھی

فرانسیسی نژاد ماریشسی مصنف اور پروفیسر لا کلیز یو چالیس سے زائد کتب کے خالق ہے۔ ان کی تخلیقات کے بارے میں انعام دینے والی کمیٹی نے بیان کیا کہ وہ اپنی تحریروں کو جذباتی انبساط اور شاعرانہ مہم جوئی سے سجانے کے ماہر ہیں۔ بحر ہند میں واقع جزیرے ماریشس کو وہ اپنا چھوٹا سا وطن قرار دیتے ہیں۔ اُن کی والدہ ماریشس اور والد فرانس سے تعلق رکھتے ہیں۔

چورانوے برس کی عمر میں رحلت پاجانے والی برطانوی ادیبہ ڈورس لیسنگ نے بے شمار ناول، افسانے اور کہانیاں لکھی ہیں۔ سویڈش اکیڈمی کے مطابق خاتون کہانی کار کے انداز میں جذباتیت اور تخیلاتی قوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا شمار نسلی تعصب رکھنے والی جنوبی افریقی حکومت کے شدید مخالفین میں ہوتا تھا۔

اورہن پامک کے لکھے ہوئے ناول ترسٹھ زبانوں میں ترجمہ ہونے کے بعد لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوچکے ہیں۔ نوبل انعام دینے والی کمیٹی کے مطابق وہ اپنے آبائی شہر (استانبول) کی اداس روح کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو انتشار کی کیفیت میں کثیر الثقافتی بوجھ برداشت کیے ہوئے ہے۔ دنیا بھر میں وہ ترکی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب تصور کیے جاتے ہیں۔

برطانوی ڈرامہ نگار ہیرالڈ پنٹر نوبل انعام ملنے کے تین برسوں بعد پھیپھڑے کے کینسر کی وجہ سے فوت ہوئے۔ نوبل انعام دینے والی کمیٹی کے مطابق وہ ایک صاحب طرز ڈرامہ نگار تھے۔ ان کے کردار جدید عہد میں پائے جانے والے جبر کا استعارہ تھے اور وہ بطور مصنف اپنے اُن کرداروں کو ماحول کے جبر سے نجات دلانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ وہ بیک وقت اداکار، مصنف اور شاعر بھی تھے۔

درک کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول کے بارے میں 'کازوو وایشی گورو' خود کہتے ہیں کہ:

''جب ''ریمینس آف دی ڈے'' منظر پر آیا تو میں اس بات کو لے کر میں بڑا فکرمند تھا کہ واحد متکلم کے بیانیہ میں لکھا گیا یہ ناول میرے زاویۂ اعتماد کے منافی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں خود کو دوہرا رہا ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے قارئین یہ کہیں کہ، ارے یہ تو وہی کتاب ہے جس میں ایک بزرگ آدمی اپنی گزشتہ زندگی کی ان کثافتوں کو بیان کررہا ہے جن کا تدارک اب اس کے امکان سے باہر ہے۔ لیکن میری سوچ کے برخلاف تنقید نگاروں نے میرے اس ناول کو کافی پسند کیا اور اس پر اپنی مثبت رائے کا اظہار خیال کیا۔''

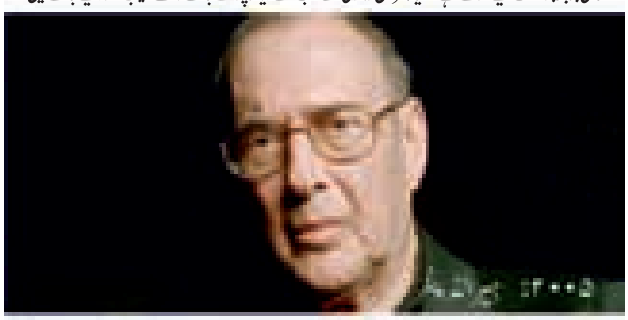

'کازوواشی گورو' کا نام جب نوبل انعام کے لئے منتخب کیا گیا تو ایک بار پھر ادب کی دنیا میں ایک ہلچل اور تجسس کا ماحول پیدا ہوگیا 'کازوواشی گورو' کو بھی اس بات پر یقین نہیں ہوا کہ ان کی تخلیق کو ادب کے سب سے بڑے اعزاز کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ حالانکہ 'کازوواشی گورو' کا نام ادبی حلقوں میں اتنا غیر معروف نہیں تھا۔ اس لئے کہ 'کازوواشی گورو' ادب کی دنیا میں اپنے تخلیقی کارناموں سے پہلے ہی ایک اہم مقام حاصل کرچکے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اس سال نوبل انعام سے نوازے جانے پر 'کازوواشی گورو' کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رائل سویڈش اکیڈمی نے یہ کہا کہ 'ان کے ناول بہترین جذباتی قوت اور انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں'۔

’کازوَو اشی گورو‘ نے ایشین امریکی مصنفین کی 2015 میں منعقدہ ورکشاپ میں کہا تھا کہ ماضی کی سامراجی طاقتوں کے بارے میں برطانیہ کی منتخب کردہ یادوں کو بھی جاپان کی تاریخ میں دیکھا جاسکتا ہے۔انہوں نے کہا تھا کہ’میں جاپان میں ،اور میں جاپان سے بہت دور ہوں لہذا میں اس کو بہت فاصلے سے دیکھ رہا ہوں ،لیکن دنیا اور دنیا کے دوسرے ملک کی تاریخ کے بارے میں چین اور جنوب مشرقی ایشیاء کے درمیان ایک تنازعہ ہمیشہ رہا ہے۔ جاپانیوں نے یہ بھولنے کا فیصلہ کیا ہے کہ وہ جارحیت پسند تھے۔’کازوَو اشی گورو‘ کی یہی خوبی ہے کہ انہوں نے اپنے جاپانی نژاد ہونے کو کبھی فراموش نہیں کیا بلکہ جاپانی سماج اور جاپان کی تاریخ سے کئی کردار کشید کئے ہیں۔ یہی ان کی افسانوی جرأت بن گئی جس نے نہیں بہت بڑا ناول نگار بنا دیا۔اپنے موقف کے اظہار کی قوت ہر تخلیق کار کے اندر نہیں پائی جاتی ہے لیکن جو تخلیق کار اپنے اظہار کی قوت کو پہچانتا ہے اور اس کے براہ راست اظہار کا حوصلہ اپنے اندر رکھتا ہے تو اس کے قلم سے معرض وجود میں آنے والی تخلیق ایک بلند پایہ معیار کو پہنچ جاتی ہے۔لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہوتا ہے جتنا کہ ایک انسان سمجھتا ہے۔یہی وہ عمل ہے جو ایک فکشن نگار کی تخلیقیت کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔یہ کام خاصہ پیچیدگیوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود’کازوَو اشی گورو‘ نے اپنے تخلیقی عمل میں ان تمام پیچیدہ گتھیوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سلجھانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔جس کی

آسٹرین ناول نگار الفریڈے ژیلینک کو نوبل انعام دینے کی وجہ اُن کے ناولوں اور ڈراموں میں پائی جانے والی فطری نغمگی ہے جو روایت سے ہٹ کر ہے۔ژیلینک کے نثر پاروں میں خواتین کی جنسی رویے کی اٹھان خاص طور پر غیر معمولی ہے۔اُن کے ناول ’کلاویئر اشپیلرن‘ یا پیانو بجانے والی عورت کو انتہائی اہم تصور کیا جاتا ہے۔اس نوبل پر فلم بھی بنائی جا چکی ہے۔

جنوبی افریقہ سے تعلق رکھنے والے ناول نگار، انشا پرداز اور ماہر لسانیات جان میکسویل کوٹزی کے نثر پاروں میں انتہائی وسیع منظر نگاری اور خیال آفرینی ہے۔کوئٹزے نوبل انعام حاصل کرنے سے قبل دو مرتبہ معتبر مان بکرز پرائز سے بھی نوازے جا چکے تھے۔ان کا مشہر ناول ’شیم‘ نسلی تعصب کی پالیسی کے بعد کے حالات و واقعات پر مبنی ہے۔

ہنگری کے یہودی النسل ادیب اصمر ے کارتیس نازی دور کے اذیتی مرکز آوشوٹس سے زندہ بچ جانے والوں میں سے ایک تھے۔انہوں نے اپنی تحریروں میں اس اذیتی مرکز پر منڈھلاتی موت کے سائے میں زندگی کے انتہائی کمزور لمحوں میں جو تجربہ حاصل کیا تھا، اسے عام پڑھنے والے کے لیے پیش کیا ہے۔ان کا اس تناظر میں تحریری کام تیرہ برسوں پر محیط ہے۔

کیریبیئن ملک ٹرینیڈاڈ اور ٹوباگو سے تعلق رکھنے والے شری ودیادھر سورج پرشاد نائپال ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ انہوں نے مشکل مضامین کو بیان کرنے میں جس حساسیت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ اُن کا خاصہ ہے۔ اُن کے موضوعات میں سماج کے اندر دم توڑتی انفرادی آزادی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

وجہ سے ’کازوَو اشی گورو‘ نے برطانوی ادب میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔

’کازوَو اشی گورو‘ کے اسلوب اور طرز تحریر میں تنوع اس لئے پایا جاتا ہے کہ انھوں نے ’’جین آسٹین‘‘ ’’مارسیل پروست‘‘ ’’اور کافکا کے طرز تحریر اور اس کے آہنگ کے امتزاج سے اپنا ایک الگ انداز اسلوب بنایا ہے۔’کازوَو اشی گورو‘ کا یہ کہنا ہے کہ اگر چہ میں برطانیہ میں پیدا ہوا اور یہیں تعلیم حاصل کی لیکن میرا دنیا کو دیکھنے کا انداز جاپانی ہے۔ کیونکہ میری تربیت جاپانی والدین نے کی ہے اور میں نے دنیا کو اپنے والدین کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔’’ کازوایشی گرو‘‘ کی یہ بات اس دنیا کو دیکھنے اور اسے سمجھنے اور پرکھنے کے اپنے ایک الگ نوعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔کہ وہ دنیا کو کس انداز سے دیکھ رہے ہیں ، اور اس میں رونما ہونے والے روزمرہ کے مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ایک انسان کے کرب کو کتنی شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔اس کی عکاسی انھوں نے اپنے ناولوں میں بڑے خوش اسلوبی کی ساتھ کی ہے۔’کازوَو اشی گورو‘ کو جب 2017 کا نوبل برائے ادب کے اعزاز سے نوازا گیا تو وہ بیحد جذباتی انداز میں یوں گویا ہوئے: ’میں عظیم مصنفین کے نقش قدم پر چلنے والوں میں شامل ہو گیا ہوں، یہ واقعی اعزاز کی بات ہے۔ دنیا اس وقت غیر یقینی کا شکار ہے اور میں دل سے کوشش کروں گا کہ اپنا مثبت کردار ادا کر سکوں۔‘

❑❑❑

'کازوواشی گورو' کے عالمی شہرت یافتہ ناول 'مجھے کبھی جانے نہ دینا' سے ایک اقتباس

مجھے کبھی جانے نہ دینا

ہیلشم اسکول میں استاد اور استانیوں کو سرپرست کی حیثیت حاصل تھی۔ مس لوسی سب سے پھرتیلی تھیں، حالانکہ ان کو ایک نظر دیکھنے سے آپ اس کا قطعی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ وہ قدرے بھاری بھرکم جسم کی مالک تھیں تقریباً بلڈاگ جیسی اور ان کے عجیب کالے بال اوپر کی سمت اٹھے ہوئے تھے جو نہ تو کبھی ان کے کانوں کو ہی پوشیدہ رکھ پاتے تھے اور نہ ہی گردن کو۔ لیکن وہ خوب مضبوط اور چست درست تھیں باوجودیکہ ہماری عمریں کم تھیں، حتیٰ کہ لڑکے بھی، دوڑنے میں ان کی برابری نہیں کر پاتے تھے۔ ہاکی کھیلنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا اور فٹبال کے میدان میں بڑے درجہ کے طلباء کو بھی اپنے بل پوتے پر روک لیتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا تھا کہ وہ 'جیمس بی' کے قریب سے بال لے کر آگے بڑھ رہی تھیں تو اس نے ان کو پیر پھنسا کر گرانے کی کوشش کی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ مس لوسی کے بجائے وہ خود ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا گر پڑا۔ جب ہم ابتدائی درجات میں زیر تعلیم تھے تب وہ ہمارے لئے کبھی بھی 'مس زیرالدین' کی طرح نہیں لگیں، جن کے پاس ہم اس وقت جاتے تھے جب ہم پر اداسی چھائی ہوتی تھی۔ اصل میں جب ہم چھوٹے تھے تو وہ ہم سے زیادہ گفتگو نہیں کرتی تھیں لیکن جب ہمارے کلاس میں اضافہ ہوا تو ہم ان کے پھرتیلے انداز کے قائل ہوئے۔

'تم کچھ کہہ رہے تھے؟' میں نے ٹامی سے کہا۔

'تم کہہ رہے تھے کہ مس لوسی تم سے یہ کہہ رہی تھیں کہ تخلیقی مزاج نہ رکھنا کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'

'انہوں نے ایسا ہی کچھ کہا تھا۔ انہوں نے کہا مجھے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے کیا کہتے ہیں،

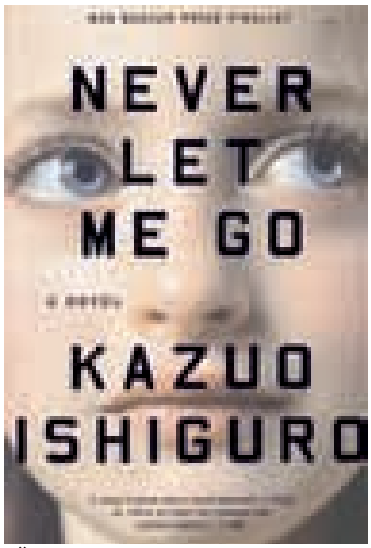

اس کی پروا بھی نہیں کرنی چاہئے۔ اب سے چند ماہ قبل یا شاید اس سے بھی پہلے۔'

ہاسٹل میں کچھ جونئر طالب علم بالائی طبقہ کی کھڑکی پر کھڑے ہوئے تھے اور ان کی نظریں ہماری جانب مرکوز تھیں۔ اس لئے اب میں ٹامی کے سامنے دبک کر ایسے بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

'ٹامی، ان کا اس طرح سے کہنا عجیب لگتا ہے۔ تم کو یقین ہے کہ تم نے صحیح سنا تھا؟'

'ہاں، میں نے صحیح سنا تھا۔' اس کی باتوں نے اچانک سرگوشی کی شکل اختیار کر لی۔ 'انہوں نے صرف ایک بار ہی نہیں کہا تھا۔ ہم لوگ کمرے میں تھے اور انہوں نے اس بارے میں کافی دیر تک باتیں کیں۔'

ٹامی نے بتایا کہ جب انہوں نے آرٹ اپریشیشن کے بعد مجھے اپنے کلاس میں آنے کے لئے کہا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک اور کلاس میں اسی طرز پر گفتگو ہوگی کہ اسے کس طرح سے مزید محنت کرنا چاہئے۔ اس طرح کی گفتگو پہلے بھی متعدد اساتذہ (سرپرستوں) کی زبانی اس کے کانوں میں پڑ چکی تھی، جن میں 'مس ایملی' بھی شامل تھیں لیکن جب وہ ہاسٹل سے استانیوں کی رہائش گاہ کی جانب قدم بڑھا رہے تھے تب ٹامی کو شک ہوا کہ بات کچھ اور ہی تھی۔ وہ مس لوسی کی آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ کھڑکی کے پاس کھڑی رہیں۔ وہیں کھڑے کھڑے مس لوسی نے ٹامی سے کہا کہ وہ ان کو پوری بات بتائے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی کہانی کا نصف حصہ ہی سنا پایا کہ وہ خود اپنے آپ ہی زیر لب بڑبڑانے لگیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ بہت سارے ایسے طلباء کو جانتی ہیں جن میں تخلیقی صلاحیت پیدا ہونے میں طویل عرصہ لگا۔ پینٹنگ، آرٹ، نظم ان سب میں سے کسی میں بھی ان کا دل نہیں لگتا تھا لیکن ایک دن وہ ایک کونے میں گئے اور ان کا فن نکھر اٹھا۔ ہوسکتا تھا کہ ٹامی کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہو۔ اس بارے میں ٹامی پہلے ہی سن چکا تھا لیکن مس لوسی کی جسمانی حرکات وسکنات میں کچھ ایسا تھا جسے وہ پوری توجہ کے ساتھ مسلسل سن رہا تھا۔

'میں یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کچھ اور بتا رہی تھیں۔ کچھ بہت ہی الگ طرح کی بات۔' اس نے مجھ سے کہا۔

اس کے بات مس لوسی کچھ ایسے بڑبڑانے لگیں جن کا سمجھ پانا ٹامی کے لئے انتہائی مشکل تھا لیکن وہ تب تک اس بات کو دہراتی رہیں، جب تک کہ وہ اس بات کو پوری طرح نہیں سمجھنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ٹامی میں مکمل کوشش کے بعد بھی پوری طرح تخلیقی صلاحیت موجود نہیں ہے تو اس کے لئے فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لئے خواہ وہ کوئی طالب علم ہو یا سرپرست، اس کے اوپر کسی طرح کا دباؤ ڈالے تو یہ غلط ہے، اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا:

'ہوسکتا ہے کہ اس بات سے تمہیں کوئی خاص مدد نہیں مل پائے لیکن یہ یاد رکھنا کہ ہیلشم اسکول میں ایک ایسا شخص ہے جو اس سے الگ فکر کا ہے۔ کم سے کم ایک انسان ہے جسے ایسا لگتا ہے کہ تم بہت اچھے طالب علم ہو۔ میں جتنے بھی طلباء سے واقف ہوں ان سب میں سب سے بہتر۔ اس کی فکر مت کرو کہ تم کس قدر تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہو۔'

●●

میں ٹھیک سے نہیں بتا سکتی کہ روتھ نے حفاظتی دستہ خود بنایا تھا یا نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہی اس کی پیشکار تھی۔ چھ سے دس سال کی عمر کے بچوں کے درمیان جب بھی روتھ کسی نئے ممبر کو دستہ کا حصہ بننے کا موقع دیتی تھیں یا کسی کو گروپ سے باہر کر دیتی تو کچھ چہرے متغیر ہوجایا کرتے تھے۔ ہمارا یہ نظریہ تھا کہ 'مس جیرالڈین' ہیلشم کی سب سے بہترین سرپرست تھیں۔ (ہیلشم ایک بورڈنگ اسکول تھا، ناول میں اس اسکول کی استادوں کو سرپرستوں کا درجہ حاصل تھا) اس لئے ہم ان کے لئے خاص طرح کے تحفہ بنایا کرتے تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ہم کاغذ کے بڑے ٹکڑے پر گوند سے پھول چپکا کر ان کے لئے تحفہ تیار کرتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے وجود کی اصل وجہ ان کی حفاظت کرنا تھا۔ میرے اس دستہ کا حصہ بننے سے بہت پہلے سے روتھ اور گروپ کے دیگر بچوں کو مس جیرالڈین کے اغوا کی اسکیم کے بارے میں معلوم تھا۔ ہم یقینی طور پر یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ اس کے پیچھے کس کا دماغ تھا۔ کئی ہمیں سینئر کلاس کے لڑکوں پر شک ہوتا تھا تو کبھی اپنے یہ کلاس کے طلباء پر۔ ایک استانی جو 'مس ایلین' کے نام سے مشہور تھیں، ان کے بارے میں ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ ہو نہ ہو، وہ بھی حتمی طور پر اس اسکیم کا حصہ ہیں۔ ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اغوا کب ہونے والا ہے لیکن ایک بات کا مکمل یقین تھا کہ اغوا جب بھی ہوگا اس میں جنگل کا کردار ضرور شامل رہے گا۔

اس جنگل کے بارے میں طرح طرح کی خوفناک داستانیں زبانزد خاص و عام تھیں۔ ہمارے ہیلشم آنے سے زیادہ دن پہلے کی بات نہیں ہے کہ ایک لڑکے کی اپنے دوستوں کے ساتھ لڑائی ہوئی اور دو دن کے بعد اس کی لاش اسی جنگل میں ملی۔ اس کا جسم ایک درخت سے بندھا ہوا تھا اور کسی نے نہایت بے رحمی کے ساتھ اس کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے تھے۔ ایک اور افواہ سنی تھی کہ ایک لڑکی کا بھوت ان درختوں کے درمیان بھٹکتا رہتا تھا۔ وہ ہیلشم ہی میں زیر تعلیم تھی اور ایک دن وہ دیوار پھاند کر دنیا کا نظارہ کرنے کے لئے نکل گئی۔ یہ بات ہمارے آنے سے بہت پہلے کی تھی۔ ان دنوں جو سرپرست استانیاں موجود تھیں وہ انتہائی سخت مزاج اور ظالم ہوتی تھیں۔ جب اس لڑکی نے واپس آنے کی کوشش کی تو اسے اسکول میں داخلہ کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہ اندر آنے کے لئے درخواست کرتی رہی لیکن اس کی درخواست رد کر دی گئی۔ وہ وہاں سے کہیں دوسری جگہ چلی گئی۔ اسی اثناء میں وہ کسی حادثہ کی شکار ہوئی اور اس کی موت ہوگئی۔ لیکن اس کا بھوت اسی جنگل میں بھٹکتا رہتا تھا۔ ہیلشم کی طرف ہوئے، اس کوشش میں کہ شائد اب اس کو اندر آنے کا موقع مل جائے۔

سرپرست استانیاں زور دے کر کہتی تھیں کہ ساری کہانیاں بکواس تھیں لیکن پرانے طلباء نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ جب وہ آئے تھے تب ان کو بھی سرپرست استانیوں نے یہی بات بتائی تھی لیکن ان کو جلد ہی اس بھیانک حقیقت کے بارے میں اسی طرح معلوم ہوگیا جس طرح ہمیں پتہ چل گیا تھا۔ رات کے وقت وہ جنگل ہمارے خیالوں میں رہتا تھا بالخصوص اس وقت جب ہم اپنے کمروں میں سونے کی کوشش کر رہے ہوتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا درخت کی ٹہنیوں کو ہلا رہی ہو اور اس کے بارے میں بات کرنے سے بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک رات جب ہم 'مارجے' کے نامی لڑکی پر بہت ناراض تھے، اس نے دن کے وقت کچھ ایسا عمل انجام دیا تھا جس کے نتیجہ میں ہمیں انتہائی شرمندگی ہوئی تھیں، اس وقت ہم نے طے کیا تھا کہ بطور سزا اسے بستر سے باہر نکال کر اس کا سر کھڑکی کی طرف کر دیا جائے۔ پہلے تو اس نے اپنی آنکھوں کو شدت سے بند کر لیا لیکن جب ہم نے اس کے ہاتھوں کو اینٹھ دیا تو وہ مجبوراً اپنی آنکھیں کھول کر چاندنی رات میں باہر جنگل کی جانب دیکھنے لگی۔ بس اتنا ہی کافی تھا۔ وہ رات بھر ڈر کے مارے سسکتی رہی۔

میں قطعاً یہ بات نہیں کہہ رہی ہوں کہ ہم ان دنوں دن بھر جنگل کی فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ ہم کئی بار ہفتوں اس کے بارے میں سوچتے تک نہیں تھے اور متعدد مرتبہ ہمت جٹا کر میں یہ بھی سوچنے لگتی تھی کہ 'ایسی بکواس افواہوں پر ہم کیسے یقین کر سکتے ہیں؟' لیکن پھر کوئی چھوٹی سی بات ہوتی جیسے کوئی آگے بڑھ کر جنگل کے مشہور واقعات میں سے کوئی کہانی سنا دیتا یا کسی کتاب کا کوئی ڈراؤنا حصہ پڑھ دیتا اور آپ کو جنگل کی یاد آجاتی۔ اس کے بعد ہم دوبارہ اس جنگل کے سائے کو محسوس کرنے لگتے تھے۔ اس لئے اس میں کسی طرح کی حیرانی کی بات نہیں تھی کہ جب ہم مس جیرالڈین کے اغوا کا تصور کرتے تو اس خیال میں جنگل کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔

□□□

ہندی سے اردو ترجمہ: انتظار مہدی

کردار

احمد وصی
K-304، پمپ ہاؤس، اندھیری ایسٹ، ممبئی
موبائل: 9833094497

مجھے ان لوگوں سے مل کر عجب احساس ہوتا ہے
جو دوہری شخصیت والے ہیں
باہر سے چھپے
اندر سے لیکن پر نکالے ہیں
وہ آدھے ریت میں ہیں اور آدھے بہتے پانی میں
تھپیڑوں کی انہیں پروا
نہ طوفانی ہواؤں کا کوئی ڈر ہے
کہ وہ ہر ایک اندیشے سے
انجانے دکھاتے ہیں خود اپنے کو
وہ اپنے آپ کو بس موم کا پتلا سمجھتے ہیں
زمانہ آگ بن جائے تو راضی ہیں پگھلنے کو
کہ وہ غم کو کتابِ زندگی کا حاشیہ مانیں
کہیں جذبات کی جب بات نکلے تو لگے ان کو
کہ جیسے سرسراتے سانپ ان کے چار جانب ہیں

اگر قدروں کے بٹنے کا بیاں ان سے کیا جائے
تو خوش ہوتے ہیں کہ پیپل کے پتے گرتے جاتے ہیں
وہ ہر حس کو جھٹک دیتے ہیں
جیسے وہم سے نکلے
انہیں رشتوں کے اپنے پن کی کاٹ آتی ہے
منتر سے
مجھے جذبوں کی دھندا تری ہوئی ہے ان کی آنکھوں میں
کسی آسیب کی صورت
انہیں بس ہنسنا آتا ہے
انہیں معلوم ہی کیا ذائقہ نمکین آنکھوں کا
کہ وہ تو استعاروں اور تشبیہوں میں بستے ہیں
وہیں ان سے ملا جائے
تو بہتر ہے
براہ راست ان سے مل کے خود پہ شرم آتی ہے

میں ایک معصوم سی لڑکی

فوزیہ رباب
مالیگاؤں، گووا
موبائل: 9175521025

میں ایک معصوم سی لڑکی
یہ دنیا جس کی نظروں میں
بہت ہی خوبصورت تھی
فقط جو زندگی کے آٹھویں ہی سال میں
بڑے ہی شوق سے ابن صفی، پروین شاکر کی
کتابیں پڑھتی رہتی تھی
جسے سب لوگ کہتے تھے
یہ ملکہ ہے خیالوں کی
ہمیشہ کھوئی رہتی ہے
نجانے سوچتی کیا ہے
وہ اک معصوم سی لڑکی...
کہ جس کی گفتگو بھی اور
دعائیں بھی عجب سی تھیں
بطور خاص وہ لڑکی
تہجد میں کھڑی ہو کر
دعا اک مانگا کرتی تھی
مرے خالق مرے مولی
تو مالک دو جہانوں کا
مری بس ایک خواہش ہے
کہ میری ذات کو مجھ پر
خدایا منکشف کر دے
مجھے حساس تو کر دے
کہ اس دنیا کے ہر غم کو
میں اپنی روح تک محسوس کر پاؤں
اور آخر کار.... جانے کب
دعائیں ہو گئیں پوری...
ہر اک احساس کو اب میں
بہت محسوس کرتی ہوں
انہی حساس جذبوں کو
میں ڈھوتے ڈھوتے اب حیران رہتی ہوں
میں اب جب دیکھتی ہوں
قتل و غارت ہر طرف یارب
بہت تکلیف ہوتی ہے
اور اکثر ایسا ہوتا ہے
مری راتیں مری آنکھوں میں کٹتی ہیں
نجانے کون سے دکھ ہیں
مجھے سونے نہیں دیتے
مجھے رونے نہیں دیتے
مگر تکلیف اب مجھ کو
ہمیشہ ذات کی گہرائی تک محسوس ہوتی ہے
اب اکثر میرے احساسات
لہو میں ڈوبے رہتے ہیں
لہو کا رنگ ہے یکساں
لہو! انسانیت کا ہے

غزل

زلفِ محبت برہم برہم می رقصم
وجد میں ہے پھر چشمِ پرنم می رقصم

عشق کی دھن میں آنکھیں نغمہ گاتی ہیں
گھول مرے جذبوں میں سرگم، می رقصم

سیّاں زخم تری ہی جانب تکتے ہیں
آج لگا نینوں سے مرہم، می رقصم

میری مستی میں سرشاری تیری ہے
میرے اندر تیرے موسم، می رقصم

وحدت کا اک جام پلا دے آنکھوں سے
ایک نظارا دیکھوں پیہم، می رقصم

آ سانول آ ایسے آن سما مجھ میں
رقصاں ہوں دو روحیں باہم، می رقصم

پھیل گئی ہر گام رباب محبت یوں
می رقصم، می رقصم رقصم، می رقصم

غزل

سفر کا اب تو بالکل ہی ارادہ کر لیا میں نے
تمہارا نام لے کر استخارہ کر لیا میں نے

ہواؤں پر، چراغوں پر بھروسا کر لیا میں نے
اندھیرا کر لیا میں نے، اجالا کر لیا میں نے

سمجھ کر سوچ کر خود کو اکیلا کر لیا میں نے
تری دانست میں نقصان اپنا کر لیا میں نے

چلا جاتا ہے پس منظر میں آخرکار ہر منظر
ابھرنا ڈوبنا تیرا گوارا کر لیا میں نے

مری خوش فہمیاں اس کی غلط فہمی سے شاکی ہیں
چلو اک تجربہ ناکام گویا کر لیا میں نے

ہے سچ تو یہ مری حقانیت پر حرف آئے گا
اگر تیری غلط شرطوں پہ سودا کر لیا میں نے

مرا منشاء تجھے دشمن بنانے کا بھلا کب تھا
یہ دکھ ہے خیرؔ کیا کرنا تھا اور کیا کر لیا میں نے

رؤف خیر
موتی محل، گول کنڈہ، حیدرآباد
موبائل: 9440945645

غزل

رفتہ رفتہ میرے اندر کون ہے مرتا ہوا
اور سب کو اپنے ہونے کی خبر کرتا ہوا

سرد سناٹوں کی یورش خون میں شامل رہی
چل رہا ہوں اپنی ہر آہٹ سے خود ڈرتا ہوا

ایک چاہت بے گھری کی راہ دکھلاتی ہوئی
اور اک دلکش سراپا دل میں گھر کرتا ہوا

کوئی بے چارہ مری راہوں کے پیچ و خم میں گم
میں کسی دیگر مسافر کا سفر کرتا ہوا

کتنی مشکل سے جٹا پائے تھے کچھ آسانیاں
اب یہ سب آسائشیں ہیں اور دل بھرتا ہوا

سننے والوں میں عدم دلچسپیاں سی تیز تر
اور قصہ گو کہ قصہ مختصر کرتا ہوا

بولنا راشدؔ کا گویا اک قیامت ہو گیا
سب نے یہ دیکھا کہ پانی تھا کہیں مرتا ہوا

راشدؔ جمال فاروقی
ٹاؤن شپ ویر بھدر (رشی کیش)، دہرادون (اتراکھنڈ)
موبائل: 9891552044

غزل

آخری وقت میں بے سود نصیحت کیا ہے
زندگی اپنی سمجھتی ہے حقیقت کیا ہے

دل سے کرتا ہے ہر انسان جوانی میں سوال
یہ شباب اور چمکتی ہوئی صورت کیا ہے

ٹھوکریں کھاتا ہے تہذیب و ادب کا مارا
اک قلمکار کی اس دور میں قیمت کیا ہے

عیش والوں سے محض عیش کی باتیں کیجے
وہ کیا سمجھیں گے کہ مفلس کی مصیبت کیا ہے

صرف نظروں کو سمندر کا نظارہ بھائے
پوچھو پیاسے سے کہ پانی کی حقیقت کیا ہے

بھیک دیتے ہیں جو دنیا کو دکھانے کے لئے
ان کو یہ علم نہیں ہے کہ سخاوت کیا ہے

داستاں لکھ نہیں پائیں گے کبھی اہل ہوس
حسن کہتے ہیں کسے عشق و محبت کیا ہے

شاعری کی تو بڑی بھیڑ نظر آتی ہے
اس زمانے میں ظفرؔ آپ کی شہرت کیا ہے

ظفرؔ مرزاپوری
میدان کی گلی، واسلی گنج، مرزاپور
موبائل: 9369728668

غزل

ہوتا ہوں مشکلات سے دوچار مستقل
اٹھتی ہے میری راہ میں دیوار مستقل

کہنے کو میرے ساتھ میں سامان کچھ نہیں
رہتا ہے پھر بھی سر پہ کوئی بار مستقل

صحرائے تشنگی کا محافظ بنا ہوں میں
میرے لیے ہے ایک ہی کردار مستقل

پتھر تھا میں تو زخم کا خطرا کوئی نہ تھا
کرتا ہے کوئی جسم پہ اب وار مستقل

ہوتا ہوں اپنے حال سے راضی نفس نفس
گرتا ہے میرے عزم کا معیار مستقل

کس سے کروں سوال کہ گم ہوں کہاں پہ میں!
بستی میں ڈھونڈتے ہیں مجھے یار مستقل

سانسوں سے کوئی ساز کا رشتہ ضرور ہے
مجھ کو سنائی دیتی ہے جھنکار مستقل

راحتؔ افق کی شرط کا اعلان ہو چکا
بڑھتی ہے ہر سوار کی رفتار مستقل

راحتؔ حسن
پریم نشان، دودھ پور، علی گڑھ
موبائل: 9997198963

غزل

وہی جو رشتہ ہے کشتی کا سطح آب کے ساتھ
وہی ہے میرا تعلق بھی اپنے خواب کے ساتھ

یہیں کہیں تو چمکتی تھی اک طلسمی جھیل
یہیں کہیں تو میں ڈوبا تھا اپنے خواب کے ساتھ

سنبھل کے چلنا، یہ تعبیر کی سڑک ہے میاں
بندھی ہوئی کئی آنکھیں ہیں ایک خواب کے ساتھ

چھلک رہی تھی کسی انتظار کی چھاگل
بھٹک رہی تھی کہیں پیاس اضطراب کے ساتھ

الجھ رہی تھی مسلسل، سوال کی لکنت
مکالمہ نہ کوئی ہوسکا جواب کے ساتھ

ہرایک حرف ستارہ، ہر ایک لفظ چراغ
میں نور نور ہوا رات کی کتاب کے ساتھ

یہ کس کے لمس کی بارش میں رنگ رنگ ہوں میں
یہ کون مجھ سے گزرتا ہے آب و تاب کے ساتھ

میں ریت ہونے ہی والا تھا جب عزیز نبیلؔ
امید آب دھڑکنے لگی سراب کے ساتھ

عزیز نبیلؔ
پی اینڈ ڈبلیو، وئیر ہاؤس، قطر اسٹیل (قطر)
موبائل: 0097455296335

غزل

مری قسمت کو آخر ہو گیا کیا
بچھڑنا ہی مقدر ہو گیا کیا

تہہ خنجر بھی دیتا ہوں دعائیں
مرا ذہنی توازن کھو گیا کیا

دھڑکنے کی زباں خاموش کیوں ہے
مرا دل روتے روتے سو گیا کیا

نظر ہٹتی نہیں کوچے سے ان کے
مجھے میرے خدا یہ ہو گیا کیا

یہ کیا میں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں ہر سو
کوئی انمول موتی کھو گیا کیا

نہی چہرے پہ وہ پہلی سی رونق
بدن کا خون پانی ہو گیا کیا

مری میت پہ دو آنسو بہا کر
وہ ساری نفرتوں کو دھو گیا کیا

سید محمد سعید
تھیتیکی، دیوبند ضلع سہارنپور
موبائل: 9450158200

غزل

شوریدۂ سری کا مزہ ہم سے پوچھئے
لمحوں میں زندگی کا مزہ ہم سے پوچھئے

محبوب اور محب میں نہ رہ جائے امتیاز
معراجِ عاشقی کا مزہ ہم سے پوچھئے

پھولوں کی دلکشی کا مزہ آپ جانئے
کانٹوں سے دل لگی کا مزہ ہم سے پوچھئے

ہم غم کو زندگی کی طرح جی رہے ہیں اب
ہوتا ہے کیا خوشی کا مزہ ہم سے پوچھئے

اک روٹھنے منانے میں صدیاں گزر گئیں
آپس کی برہمی کا مزہ ہم سے پوچھئے

جیسے بھی، جس طرح بھی ہو کاٹی ہے زندگی
اپنوں کی بے رخی کا مزہ ہم سے پوچھئے

کل آ گئی تھی صرف خیالوں میں کربلا
ہونٹوں کی تشنگی کا مزہ ہم سے پوچھئے

توبہ کو ہاتھ اٹھے نہ تابشؔ کسی بھی طور
آدابِ مئے کشی کا مزہ ہم سے پوچھئے

ایم ایچ تابشؔ ردولوی
محلہ پورہ بساون، ردولی ضلع فیض آباد
موبائل: 9956241167

غزل

تعمیر کرو دشت، بیابان بناؤ
کچھ اپنی چمکتی ہوئی پہچان بناؤ

بن جائے تو اک صورت امکان بناؤ
ہر دشت تمنا کو گلستان بناؤ

مسمار نہ ہوتے کبھی آثارِ دل و جان
انسان سے رکھتا اگر انسان بناؤ

میں گوشہ نشینی میں بھی خوشحال ہوں اپنی
تم اپنا جسے چاہو نگہبان بناؤ

موسم کو بدلنے میں ذرا وقت لگے گا
اب اتنا برا منھ نہ مری جان بناؤ

یاں بات نئے پیر بنانے کی نہیں ہے
کچھ اور یہاں اپنے مریدان بناؤ

اخترؔ یہ زمیں اب اثر انداز نہ ہوگی
تم لاکھ اسے حشر کا سامان بناؤ

شاہدؔ اختر
گیا کالج، گیا (بہار)
موبائل: 9939970616

غزل

وجہ سکون قلب رہی باادب رہی
وہ زندگی جو تیرے سوا بے طلب رہی

کیا سر پھری ہوا تھی بہر سو غضب رہی
لیکن تری گلی میں بڑی باادب رہی

کچھ بات تھی کہ شعر تو سب نے سنے، مگر
چہرے پہ اس کے بزم میں رنگت عجب رہی

روشن خیال لوگ بھی قربت نہ پا سکے
اتنی بلند بیچ میں دیوار شب رہی

دیکھوں کبھی دیارِ اماں ان کے لطف سے
اک آرزوئے دید یہی جاں طلب رہی

روشن رہا غزل میں ہر اک پیکر حیات
جب تک نگاہِ فکر میں شمع ادب رہی

پوچھا تو اس نے حال مرا کیا کہوں عزیزؔ
وہ بات جو تھی دل میں وہی زیر لب رہی

ڈاکٹر عزیزؔ خیرآبادی
گل برگ منزل، کالا پیادہ، خیرآباد اودھ، سیتاپور
موبائل: 9450901544

غزل

نور اک ہویدا پھر چار سو سے ہوتا ہے
دل کا رابطہ جب بھی اللہ ہوٗ سے ہوتا ہے

خامشی چھپاتی ہے عیب اور ہنر دونوں
شخصیت کا اندازہ گفتگو سے ہوتا ہے

کانپ کانپ جاتی ہے کائنات دو عالم
مفلسی کا سودا جب آبرو سے ہوتا ہے

سو گناہ مٹتے ہیں اک قدم اٹھانے پر
ایک صاحب ایماں جب وضو سے ہوتا ہے

کیا اسے محبت کی انتہا سمجھ لوں میں
ہر خطاب کیوں اس کا لفظِ تُو سے ہوتا ہے

بے سبب نہیں اپنی دوستی حسینوں سے
دل کا کوئی تو رشتہ رنگ و بو سے ہوتا ہے

حسرتوں کا عاشق ہے شمسؔ اس لیے انساں
زیست کا سفر آساں آرزو سے ہوتا ہے

شمس رمزی
N-19، پہلی منزل، گلی نمبر 19، برہم پوری، دہلی 53
موبائل: 7389546474

غزل

یہاں زندگی کے سہارے بہت ہیں
جو ہے اک بھنور تو کنارے بہت ہیں

یہ مانا کہ تم ہو سکے نہ کسی کے
مگر اس جہاں میں تمہارے بہت ہیں

تری چاہتوں کی وجہ سے خدایا
جہاں میں ترے غم کے مارے بہت ہیں

کبھی ایسا لگتا ہے کوئی نہیں ہے
کبھی یوں لگا کہ ہمارے بہت ہیں

غریبی، جہالت، تشدد، ترقی
سیاست کی دنیا میں نعرے بہت ہیں

ہمارے خیالوں میں شبنم کے موتی
حقیقت میں زاہدؔ شرارے بہت ہیں

ڈاکٹر محمد زاہد
B-5، پرنس دلاور جاہ لین، کولکاتا
موبائل: 8697194075

غزل

پس منظر کو منظر کاٹتا ہے
تونگر کو گداگر کاٹتا ہے

فقیروں سے الجھتی ہے فقیری
قلندر کو قلندر کاٹتا ہے

مری قسمت میں ہیں کانٹے ہی کانٹے
مجھے پھولوں کا بستر کاٹتا ہے

میسر ہے جسے شاداب لہجہ
وہی شیشے سے پتھر کاٹتا ہے

سخنور ڈوب جاتا ہے سخن میں
سمندر کو شناور کاٹتا ہے

میں اپنی فلم کا ہیرو ہوں لیکن
مجھے ہر بار جوکر کاٹتا ہے

مرا سورج اتر کر آسماں سے
زمیں کا روز چکر کاٹتا ہے

مرا بھائی مرا بھائی ہے اطہرؔ
برادر کو برادر کاٹتا ہے

حسن رضا اطہرؔ
حنفیہ غریب نواز، سیونڈیہہ، بوکارو سٹی، جھارکھنڈ
موبائل: 9431322360

غزل

گلشن نگاہ میں ہے نہ صحرا نظر میں ہے
اس دلربا کا جلوۂ زیبا نظر میں ہے

کلیوں کو جس کے رنگ سے رنگینیاں ملیں
اس نازش بہار کا مکھڑا نظر میں ہے

اب دل سے چھیڑ چھاڑ کی کوشش نہ کیجئے
جی ہاں حضور آپ کی منشا نظر میں ہے

سب کچھ تو ذہن وفکر کے پردوں سے مٹ گیا
اس بے وفا کا آج بھی چہرا نظر میں ہے

میں چل پڑا ہوں منزل مقصود کی طرف
رہبر بتا دے کون سا رستہ نظر میں ہے

سب کچھ تو لوٹ لے گئے اربابِ اختیار
اب مفلس و یتیم کی کٹیا نظر میں ہے

نیرنگیٔ جہان کو میں کیا کہوں رضاؔ
عقبیٰ کو لوگ بھولے ہیں دنیا نظر میں ہے

رضاؔ امروہوی
گلی نمبر ۱۲، ششی گارڈن، دہلی
موبائل: 7827810345

غزل

چمکتے بجھتے ستاروں کے ساتھ کاٹتے ہیں
کس اہتمام سے ہم اپنی رات کاٹتے ہیں

یہ تیغ بغض سے ظلم وستم کے پروردہ
مسافران محبت کے ہاتھ کاٹتے ہیں

سوال بیعت آب فرات اٹھتے ہی
عصائے تشنہ لبی سے فرات کاٹتے ہیں

مری زبان کی قیمت لگانے والے لوگ
مجھے خرید نہ پائے تو بات کاٹتے ہیں

انہیں کا نام سہارا ہے دکھ کے ماروں کا
انہیں کے نام سے ہم حادثات کاٹتے ہیں

ہماری قدر کرو ہم ہیں شاعرانِ جنوں
قلم کی نوک سے فصل حیات کاٹتے ہیں

ہاشم رضا جلالپوری
محلہ کریم پور، پوسٹ نگپور، جلالپور، امبیڈکر نگر
موبائل: 7389546474

کھاسی زبان اور اس کی مشہور لوک کتھائیں

ف۔س۔اعجاز
25-B، زکریا اسٹریٹ، کولکاتا
موبائل: 9830483810

کھاسی مائتھولوجی کی رُو سے خدا نے انسانی نسل کو سولہ آسمانی خاندانوں میں تقسیم کیا تھا جن میں سے سات نسلیں زمین پر آ گئیں جنہیں ''سات جھونپڑیوں کے بچّے'' (انگریزی میں Children of Seven Huts) کہا جاتا ہے۔ اور نو نسلیں آسمان میں رہ گئیں۔ روایت کہتی ہے کہ ایک آسمانی سیڑھی ''لُم سوفیٹ بنیگ'' (Lum Sofet Bneg) نامی پہاڑ کی چوٹی پر ٹکی ہوئی ہے جو میگھالیہ کے موجودہ ضلع ''ری بھوئی'' میں واقع ہے۔ دھرتی پر رہنے والوں کو اس سیڑھی کے ذریعہ آسمان پر جا کر خدا کی عبادت کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن ان دھرتی پر رہنے والے سات خاندانوں نے ایک بڑا گناہ کیا۔ انہوں نے ''لُم ڈینگئی'' پہاڑ کے ایک ابدی پیڑ کو کاٹ ڈالا۔ (یہ پہاڑ بھی موجودہ ری بھوئی ضلع میں واقع ہے)۔ یہ خدا کے احکام کے خلاف تھا اس لئے بطور عتاب خدا نے اُس آسمانی سیڑھی کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا۔

کھاسی زبان Austroasiatic یعنی جنوب مشرقی زبانوں کے گروہ میں سے ایک ہے۔ 'اوسٹرو' لاطینی لفظ سے برآمد ہوا ہے جس سے مراد جنوب/جنوب مشرقی ہوا ہے۔ چنانچہ کھاسی ایک جنوبی ایشیائی زبان ہے جو ہندوستان کے صوبے میگھالیہ کے شمالی اضلاع سے لے کر برہمپتر کی وادی تک کھاسی اور جینتیا قبیلوں میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آسام اور بنگلہ دیش کی آبادی کا بھی ایک قابل قدر حصہ یہ زبان بولتا ہے۔ جنوب مشرقی زبانوں میں کمبوڈیائی اور مونؔ (Mon) زبانوں سے اس کا تعلق ہے۔

کھاسی زبان بولنے والوں کی تعداد 16 لاکھ ہے اور ان میں سب سے زیادہ کھاسی بولنے والے جن کی تعداد تقریباً 12 لاکھ ہے میگھالیہ میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ میگھالیہ سے متصل ریاست آسام اور ہندوستان کی سرحد سے متصل بنگلہ دیش کے علاقوں کے باشندوں میں یہ زبان کسی حد تک رائج ہے۔ ۲۰۰۵ء

> کولکاتا سے شائع ہونے والا اردو ماہنامہ 'انشاء' کے مدیر اور کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم جناب ف۔س۔اعجاز گزشتہ چار دہائیوں سے اردو کی فروغ میں سرگرم ہیں۔ انہوں نے 'انشاء' کے کئی گرانقدر نمبر بھی شائع کئے اور اردو زبان و ادب کے حوالے سے نئی نسل کے جوانوں کی رجحان سازی کا بھی کام کر رہے ہیں۔

سے یہ میگھالیہ کے بعض اضلاع کی سرکاری زبان ہے۔ یونیسکو کی رائے میں یہ زبان اب کسی بھی اندیشے سے باہر ہے۔ جبکہ کھاسیوں کا حکومت ہند پر زبردست دباؤ ہے کہ اس زبان کو دستور ہند کے آٹھویں شیڈول میں شامل کیا جائے۔ کھاسی اپنی عوامی روایات اور داستانوں میں زندہ ہے۔ بیشتر پہاڑوں، چٹانوں، دریاؤں، آبشاروں، پرندوں، پھولوں اور جانوروں سے وابستہ کہانیوں میں کھاسی زبان کا جوبن دیدنی ہے۔ کھاسی زبان کی ابجد لاطینی اور زبان کا سسٹم بنگالی طرز پر ہے لیکن موجودہ عہد میں اس نے اپنے ادب کو رومن اسکرپٹ میں منتقل اور منظم کر لیا ہے۔ یعنی اپنی زبان کو رومن انگریزی میں لکھنے کا رواج کھاسی قبیلے نے اپنا لیا ہے۔ دستیاب معلومات کے مطابق پہلا کھاسی اخبار ایک ماہنامے کے طور پر U Nong Kit Khubor نام سے 1981 میں ایک برطانوی فوجی افسر ولیم ولیمز نے شائع کیا تھا۔ (راقم کو اشتباہ ہے کہ یہ بات 1981 سے پہلے کی بھی ہو سکتی ہے) کھاسی زبان کی اہم بولیاں سوہرا اور شیلانگ کی ہیں جبکہ 8 بولیاں اور لہجے ہیں جو شیلانگ کے مضافات میں رائج ہیں۔ سوہرا علاقے کا لہجہ معیاری کھاسی سمجھا جاتا ہے۔

زبان کی نزاکتیں اس کے امتیازی اصوات سے متعین ہوتی ہیں۔ شمال مشرقی ہندوستان کے متذکرہ خطہ میں خصوصاً بولی جانے والی بھاشا کھاسی اپنے جغرافیائی محل وقوع سے بھی متاثر ہے۔ اپنے شمال میں آسامی، جنوب میں بنگالی، مشرق میں تبتی برمی اور تبتی برمی کے آمیزے کے علاوہ منی پوری، میزو اور بوڈو زبانوں سے بھی اس کا اتصال ہے۔ اس طرح اس کے اپنے لہجے حتمی طور پر متعین نہیں ہیں۔

اصلاً کھاسی محض ایک بولی تھی۔ پھر کھاسی لوگوں نے بنگلہ اسکرپٹ استعمال کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد یہاں عیسائی مشنریاں وارد ہوئیں تو ایک Welsh یعنی برطانیہ کے ضلع ویلز کے ایک عیسائی تھامس جونز نے اس زبان کو رومن اسکرپٹ میں منتقل کر دیا۔ کھاسیوں کی اکثریت (تقریباً 85 فی صد) نے عیسائیت قبول کر لی۔ جبکہ اقلیت اپنے پرانے مذہب پر کاربند ہے جس کا نام ''کائنیم کھاسی'' ہے۔

اس کا عقیدہ ہے کہ مُرغ (اُوسیار کھراؤ جُتا نگ) انسان کے عوض قربان کیا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ مُرغ انسانی گناہ کا حامل ہوتا ہے اور اس کی قربانی آدمی کے گناہوں کا نپٹارا کر دیتی ہے۔ کھاسیوں میں کچھ متفرق مذاہب بھی مانے جاتے ہیں۔ میگھالیہ کے جینتیا پہاڑوں میں رہنے والے ہندو بھی ہیں۔ اور بین المذہبی شادیاں کر کے رہنے والے مسلم بھی پائے جاتے ہیں۔ کھاسی لوگوں کی خاص پیداوار پان، سپاری، سنترہ، چاول اور مقامی سبزیاں ہیں۔

دستور ہند کے تحت کھاسیوں کو شیڈولڈ قبیلہ تسلیم کیا جاچکا ہے۔ ان کا معاشرہ مادرانہ نظام کا حامی ہے جس کے تحت عورتوں کے اختیارات مردوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ جائداد میں بھی عورتوں کے حقوق زیادہ ہوتے ہیں۔

حکومت ہند کی موجودہ پالیسی کے تحت ساہتیہ اکادمی کو شمال مشرق کے پچھڑے ہوئے قبیلوں کے ادب کے فروغ کے لئے بھی کام کرنا ہوگا۔ چنانچہ 22-23 اکتوبر 2016 میں شیلانگ کی نارتھ ایسٹ ہل یونیورسٹی (NEHU) میں پہلی بار کھاسی لوک کتھاؤں پر ایک ترجمہ ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا۔ ورکشاپ کے ڈائرکٹر پروفیسر ایم۔اسد الدین (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کے علاوہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال، راقم الحروف، پروفیسر عزیز پریہار (لدھیانہ)، پروفیسر سہیل احمد فاروقی (نئی دہلی)، انتخاب حمید خان (اورنگ آباد، مہاراشٹر) نے کھاسی کتھاؤں کا اردو میں ترجمہ کیا اور کھاسی عوامی زندگی اور ادب سے جانکاری حاصل کرنے کے لئے مقامی جگہوں کی سیاحت بھی کی۔ یہاں میں کھاسی لوک کتھاؤں کے اپنے ترجمے پیش کر رہا ہوں۔

❑❑❑

زمین کی تشکیل

جب دھرتی بنائی گئی وہ ایک میدان تھی جس میں وسیع جنگل اور ہموار دریا تھے۔ پھر ایک روز زمین پر گھومتے پھرتے تین دیویوں کا ڈِنگ، کا اُم اور کاس نگی کی ماں مرگئی۔ یہ دیویاں آگ، پانی اور دھوپ کی دیویاں تھیں۔ بیٹیوں کے لئے ضروری ہوگیا کہ کوئی طریقہ ایسا دریافت کریں کہ اُن کی ماں کی لاش اُن کی آنکھوں سے دور کہیں رکھی جائے اور اُسے دھرتی پر نہ دکھایا جائے۔

فیصلے کے مطابق طے یہ ہوا کہ کاس نگی، سب سے چھوٹی بیٹی کو اُس کی آخری رسومات ادا کرنا چاہئیں۔ اِس لئے کاس نگی اپنی پوری طاقت سے باہر نکلی اور اُس نے پوری تپش کو آگے بڑھایا یہاں تک کہ سب دریا سوکھ گئے اور جنگل کے سارے پتّے اور گھاس بکھر گئے۔ لیکن ماں کا جسم نہیں جلا۔ اِس لئے کاس نگی بہنوں کے پاس واپس آئی اور بولی ''میں نے اپنی ساری طاقتیں خرچ کر دیں لیکن ہماری ماں کی لاش اب بھی دھرتی پر پڑی ہے اور ہماری نظروں کے سامنے ہے''۔

اُس کے بعد دوسری بہن کا اُم نے رسومات ادا کرنے کی ذمہ داری لی اور وہ بادلوں کے بہت بڑے جتّھے کے ساتھ گئی اور زمین پر لگاتار بارش برسائی۔ یہاں تک کہ دریا اور تالاب بھر گئے لیکن اُس کی ماں کی لاش برباد نہ ہوئی۔ لہٰذا کا اُم بھی لوٹ کر بہنوں کے پاس آئی اور بولی ''میں نے اپنی ساری طاقتیں خرچ کر دیں لیکن ہماری ماں کی لاش اب بھی ہمارے سامنے زمین پر پڑی ہے''۔

اب تو بڑی بہن کا ڈِنگ کو ضروری رسمیں ادا کرنا تھا۔ اُس نے بڑے بڑے شعلوں کو ہوا دی۔ آگ جنگلوں کو بہا لے گئی اور زمین جلنے لگی۔ حتیٰ کہ وسیع کھیت، میدان اپنے خدوخال کھو بیٹھے اور ماں کی لاش جل گئی۔

اُس وقت سے زمین اُس حالت میں برقرار ہے جس حالت میں اُسے آگ نے چھوڑا تھا، پہاڑوں، وادیوں اور تنگ گھاٹیوں سے بھری ہوئی۔ زمین اب بہت زیادہ خوبصورت جگہ بن گئی ہے۔ اور انسان یہاں بروقت آسمان سے رہنے کے لئے آگیا۔

مور کو خوبصورت پَر کیسے ملے

جب دنیا جوان تھی اور سب جانور انسان کی بولی بولتے تھے تب مور اُوکلیو (U Klew) خوبصورتی کے دکھاوے کے بنا بھورے پروں والا ایک معمولی پرندہ تھا۔ لیکن اُن دنوں میں بھی اسے فخر و غرور ملا ہوا تھا۔ اور وہ اپنی شاہی عظمت پر نازاں تھا، محض اس وجہ سے کہ اس کے پر دوسرے پرندوں سے زیادہ کھڑے اور اُس کی دم اس کے دوسرے ساتھیوں سے زیادہ لمبی اور شاندار تھی۔

وہ انتہائی ناقابل رہائش پڑوسی ہوا کرتا تھا۔ اس کی دُم اس قدر لمبی اور اتنی وزنی تھی کہ اٹھانے لائق نہ تھی۔ وہ چھوٹے پنچھیوں کے گھروں کے اندر نہیں گھس سکتا تھا۔ لہٰذا بڑے لوگوں کے درباروں میں ہی شرکت کرتا تھا اور جنگل میں تہواروں کے موقعوں پر دیگر امیر پرندے ہی اس کا جی بہلایا کرتے تھے۔ اِس سے اُس کا اپنے بارے میں گمان زیادہ اونچا ہوگیا اور اپنی نگاہ میں اپنی اہمیت بڑھ گئی۔ وہ اس قدر مغرور اور ناقابل برداشت ہوگیا کہ اس کے پڑوسی اُسے ناپسند کرنے لگے۔ وہ سب طرح کے ہنسی مذاق میں اس کے گھمنڈ کی قیمت اسے ادا کرنے کی کوشش کرتے۔

اس کی خوشامد کرتے، دکھاوا کرتے کہ وہ اسے بہت اونچا رکھتے ہیں، محض اُسے چھاتی پھُلانے اور بڑے بول بولتے دیکھ کر مزہ لینے کے لئے۔ ایک دن انہوں نے دکھاوے کے لئے پنچھیوں کا ایک بڑا دربار

لگایا تا کہ ایک سفیر چُنا جائے جو جنگلی پرندوں کی نیک خواہشات لے کر کاس نگی خوبصورت حسینہ کے پاس جائے جو نیلی سلطنت پر راج کرتی تھی اور ان کی دنیا پر اپنی چمکیلی روشنی جی کھول کر برساتی تھی۔ اور یہ کہ اس دربار میں اُوکلیو کو اس اعزاز کے لئے چُنا گیا ہے۔

مور بہت خوش ہوا۔ ہمیشہ سے زیادہ پھول گیا اور اپنے آئندہ دورے کی باتیں بڑھا چڑھا کر کرنے لگا۔ وہ کہتا، نہ صرف میں پرندوں کے ایک سفیر کی حیثیت سے جا رہا ہوں بلکہ اپنی غرض سے بھی جا رہا ہوں۔ میں شاہی حسینہ کو رجھا کر اپنی بیوی بناؤں گا اور نیلی سلطنت میں اُس کے ساتھ زندگی گذاروں گا۔

پرندوں نے اس کے خرچ پر خوب ڈھکے چھپے مزے لئے۔ کسی نے خواب میں بھی نہ سوچا کہ وہ اتنا اونچا اُڑنے کی کوشش کرے گا کیونکہ وہ ایک بہت بھاری پرندہ ہے اور کبھی پیڑ سے زیادہ اونچا نہیں اُڑ پایا تھا لیکن ہر ایک کو حیرت تھی کہ مور نے کیوں نیلی دنیا کو جانے کا ارادہ ظاہر کر دیا اور وہ اپنے ساتھیوں کو الوداع کہہ کر روانہ ہو گیا۔ وہ سب آپس میں یہ سوچ کر ہنس رہے تھے کہ کس طرح مور خود کو حقارت کا سامان بنا رہا ہے۔ اسے کتنا غصہ آئے گا جب وہ جان جائے گا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ ان سب کی امیدوں کے برخلاف اُوکلیو نے بہرحال اپنی اڑان جاری رکھی۔ حتیٰ کہ وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور وہ متعجب اور خوف زدہ ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا مذاق اسے کس خطرے میں لے جا سکتا ہے۔

مضبوط پروں والا اُوکلیو اوپر سے اوپر اڑتا چلا گیا۔ کہیں نہیں رکا وہ۔ یہاں تک کہ آسمان تک جا پہنچا اور کاس نگی کے محل پر نظر آنے لگا جو سب سے خوبصورت اور سب سے اچھی تھی۔

کاس نگی اپنے مہمان محل میں اکیلی رہا کرتی تھی اور اکثر اُس کا دل دوستی کے لئے بے چین ہو اٹھتا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ ایک اجنبی اس کے دروازے پر موجود ہے تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ اس نے جلدی سے اُس کا استقبال کیا اور خوش آمدید کہا۔ جب اُسے اُس کے دورے کا مقصد معلوم ہوا تو وہ اور زیادہ خوش ہوئی۔ اس نے سوچا ''اس کے بعد کبھی دوستی کے لئے نہیں تڑپوں گی کیونکہ یہ شریف پرندہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا''۔ وہ دنیا پر مسکرائی اور بہت شادماں ہوئی۔

جب اُوکلیو زمین چھوڑ کر روشنی اور دھوپ کے

ملک میں داخل ہوا تو اس نے اپنی خودغرضی اور جھوٹے زعم سے تب بھی پیچھا نہیں چھڑایا بلکہ اس کی خودغرضی اور گھمنڈ اور زیادہ بڑھ گیا کیونکہ اس کے آرام و آسائش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ خوبصورت لڑکی نے اُس کا جس اشتیاق سے استقبال کیا اُس نے اُس کا غرور اور بڑھا دیا اور وہ اُس کے ہاتھوں سے اور زیادہ خدمات کی مانگ کرنے لگا۔ جب وہ اس کے سامنے حاضر نہ ہوتی وہ ناراض ہو جاتا۔ اس کے برعکس کاس نگی شریف اور فیاض تھی۔ وہ دوسروں سے مہربانی سے پیش آ کر خوش ہوتی تھی۔ وہ دنیا پر اپنی روشنی پھیلا کر دیکھنا چاہتی کہ دنیا اس کے جذبے اور مسکراہٹوں کا جواب دیتی ہے یا نہیں۔ اپنے دوست اُوکلیو کو اس نے مسلسل توجہ اور بے مثال محبت پیش کی جو اس نے بڑی بیگانگی سے وصول کی، یہ سوچتے ہوئے کہ یہ ساری توجہ اُسے اُس کی اپنی عظمت کی وجہ سے ملتی رہی ہے۔ اس میں اس کی شریک حیات کی بے غرض محبت اور لگاؤ دخل نہ تھا۔

پیشتر کاس نگی نے اپنی فیاضی کے اظہار کا ایک راستہ بنایا تھا جس سے وہ اپنی گرم کرنیں زمین پر بکھیر دیتی تھی۔ لیکن اُوکلیو کے آنے کے بعد اس کا اتنا وقت اس کے ساتھ خرچ ہو جاتا کہ وہ اپنے محل کو چھوڑ کر کہیں جانے لائق نہ رہی۔ لہٰذا زمین ٹھنڈی اور بے کس و اُداس ہو گئی۔ جنگل کے پرندے چہچہاہٹ کھو بیٹھے۔ اُن کے پر لٹک گئے اور زمزمے ختم ہو گئے۔ اُوسلاپ (U Slap) (بارش) آئی اور اُس نے بے رحمی سے اُن کے آرام دہ گھونسلوں کو اجاڑ دیا جس کے نتیجے میں ان کے چوزے مر گئے۔ اُولیو (U Lyoh) دُھند کا دیوتا اپنے گہرے بادل لے آیا اور چاول کے کھیتوں پر انہیں روک دیا جس سے کوئی فصل نہ پک پائی اور کا ایر یونگ (Ka Eriong) طوفان نے پیڑوں کو ہلا دیا۔ سب پھل برباد ہو گئے۔ چڑیاں بے گھر ہو کر بھوکی بھٹکنے لگیں۔

اپنے اس زبردست افلاس میں انہوں نے انسان سے مشورہ لینا چاہا جسے وہ کسی بھی جانور سے زیادہ عقلمند سمجھتے تھے۔ علم غیب کی مدد سے انسان نے تحقیق کی کہ یہ تمام بدنصیبی نیلے ملک میں اُوکلیو کی موجودگی کے سبب سے ہے۔ کیونکہ اس کی خودغرضی کاس نگی کو دنیا پر اپنی روشنی اور مسکراہٹیں نچھاور کرنے سے روکتی ہے۔ ماضی میں ایسا نہیں تھا۔ اور جب تک

اُوکلیو جنگل کی دھرتی پر لوٹ کر نہ آئے ترقی کی امید نہیں کی جاسکتی۔

اُن دنوں جنگل میں ایک چالاک عورت رہا کرتی تھی جس کا نام کاسَبوئت (Ka Sabuit) تھا۔ انسانوں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے پرندوں نے نیلے ملک سے مور کو واپس لانے کے لئے اُس کی مدد طلب کی۔ اُس وقت کاسَبوئت زبردست قحط پڑنے کی وجہ سے بہت نادار تھی۔ اُس کے پاس جنگلی جڑوں کے علاوہ کھانے کو کچھ نہ تھا اور اپنے باغ میں بونے کے لئے کوئی بیج بھی نہ تھے سوائے سرسوں کے بیج کے جو بیجوں میں سب سے سستے اور معمولی ہوا کرتے تھے۔ انہیں بوتے ہوئے بھی اسے ڈر لگتا تھا مبادا بھوکی چڑیاں آئیں اور فصل نگل لیں اور اُس کے پاس ایک دانہ نہ بچے۔

چڑیاں اُس کے پاس مشورے کے لئے آئیں تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اُسے امید ہوئی کہ وہ کسی طرح اُن سے وعدہ لے لے گی کہ وہ اُس کے باغ کو برباد نہیں کریں گی۔ انہوں نے اُسے اپنی مشکل بیان کی تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ تیرہ قمری مہینوں میں اُوکلیو کو جنگل میں واپس لے آئے گی لیکن اس کی دو شرطیں ہوں گی۔ پہلی یہ کہ چڑیاں اُس کے باغ کے بیج نہیں نوچیں گی۔ دوسری یہ کہ اگر جانور اس کی فصلیں کھانے یا زمین پامال کرنے آئیں گے تو وہ انہیں برباد کردیں گی۔ یہ شرطیں آسان معلوم ہوئیں تو پرندوں نے انہیں فوراً قبول کرلیا۔

اس چالاک عورت کا باغ جنگل کے ایک کُھلے حصے میں تھا جسے پہاڑ کی کئی چوٹیوں سے سیدھا دیکھا جاسکتا تھا۔ اور اُن پرانے دنوں میں سورج اس پر صبح سے رات تک چمکتا تھا۔ کاسَبوئت نے پرندوں سے بات چیت کے بعد اُس جگہ کی راہ لی۔ اور بڑی احتیاط اور صبر کے ساتھ زمین کھودنا شروع کی۔ اس کام میں اُس نے ضرورت سے زیادہ ہی وقت دیا۔ اُس کے پڑوسی ہنسنے لگے اور مذاق میں اُس سے پوچھا کیا سرسوں کے بیج سے اس زمین میں قیمتی پتھروں کی فصل اُگنے کی امید ہے جو تم اس باغ میں اتنی محنت کر رہی ہو؟ لیکن بوڑھی عورت نے کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ صبر سے کام کرتی رہی اور خود سے صلاح و مشورہ جاری رکھا جبکہ پرندے انتظار کرتے اور دیکھتے رہے۔

اُس نے اپنا سرسوں کا بچھونا ایک عورت کی

'نیا دور' کے بیحد اصرار پر جدید دور کے مشہور شاعر اور فلمی دنیا کے معروف نغمہ نگار ندا فاضلی کی شریک حیات محترمہ مالتی جوشی نے ندا صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضمون ارسال کر دیا ہے۔ انہوں نے ان کی کچھ نادر تصاویر بھی بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ ندا فاضلی کی دوسری برسی پر فروری ۲۰۱۸ء کے شمارے میں ہم بطور خراج عقیدت ایک بھرپور گوشہ شائع کریں گے۔

شکل میں بنایا جس سے اس کے پڑوسیوں کی خوشیاں اور جوش میں آگئیں اور ان کی طرف سے کئی سوالات پوچھے گئے۔ لیکن کاسبوئت نے اب بھی کوئی توجہ نہ دی۔ وہ صبر سے کام کرتی رہی اور غور و فکر کرتی رہی جبکہ پرندے انتظار کرتے اور دیکھتے رہے۔

رفتہ رفتہ بیج پھوٹنے لگے اور زمین کا قطعہ جسے عورت کی شکل کا بنایا گیا تھا چمکدار گیلی ہری پتیوں سے ڈھک گیا۔ چڑیاں دیکھتی رہیں اور جانوروں کو کھیت سے دور روکتی رہیں اور وہ چالاک عورت اپنے باغ میں پانی ڈالتی اور کھیت کی تراش خراش کرتی رہی۔

وقت پر تمام سرسوں کے پودوں میں ننھے پیلے پھول اُگ آئے۔ اب زمین کا وہ قطعہ دور سے ایک ایسی عورت کی طرح دکھائی دیتا تھا جس نے سنہری لبادہ پہن رکھا ہو جو آنکھوں کو خیرہ کردے۔ پڑوسیوں نے اسے دیکھا تو اس کی خوبصورتی پر متعجب ہوئے اور چالاک عورت کی ذہانت کی بہت تعریف کی۔ لیکن کوئی بھی اس خاتون کے عجیب ولولے کا سبب نہ سمجھ پایا۔ اور کاسبوئت نے اس پر کوئی روشنی نہ ڈالی۔ وہ اب بھی صبر سے کام کرتی رہی اور خود سے مشورہ کرتی رہی۔

اوپر نیلے ملک میں اُوکلیو اپنا جبر، مطلق العنانی اور سرکشی جاری رکھے ہوئے تھا۔ جبکہ اس کی شریف بیوی اُس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش میں رہا کرتی تھی۔ سب نازوں پلے لوگوں کی طرح جن کی آرزوئیں پوری کردی جاتی ہیں مور تنک مزاج ہوگیا۔ اب اسے خوش کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ ہر تبدیلی سے جلد اُوب جاتا اور ہمیشہ کسی نئی بات کی تلاش میں رہتا حتیٰ کہ اب کسی بات سے اس کا اطمینان نہ ہوتا تھا۔ کاس نگی کے محل کی چمک دمک اور شان و شوکت بھی ماند ہونا شروع ہوگئی۔

اب اور تب اُس کے پرانے ساتھیوں کی یادیں اس کے دماغ کو پریشان کرنے لگیں۔ اور وہ اکثر خود سے پوچھتا، جنگل کے پرانے ساتھیوں کا انجام کیا ہوا ہوگا۔ ایک دن اس نے چاہا کہ وہ محل کے احاطہ سے اس کی پرانی آمد و رفت کے راستوں کا نظارہ کرادیں۔ چنانچہ ایسا ہوا اور جب وہ ایک کے بعد دوسری جانی پہچانی جگہ دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں ایک منظر میں گرفتار ہوگئیں۔ اُسے ایسا نظر آیا کہ ایک خوبصورت عورت جنگل کے درمیان ایک باغ میں سرتا پا سونا پہنے ہوئے سو رہی ہو۔ اس جنگل میں وہ کبھی رہا

کرتا تھا۔اس کی جھلک دیکھکر اس کا من اندر سے پگھل کر پانی ہوگیا اور اسے اس ہیولہ سے محبت ہوگئی۔اپنی حسین اور اعلیٰ نسب بیوی کاس نگی کے تئیں اپنے عہدِ وفاداری کو وہ بھلا بیٹھا۔وہ اب صرف اُس کنواری کے بارے میں سوچ سکتا تھا جو سونے میں ملبوس تھی،جنگل کے ایک باغ میں لپٹی سو رہی تھی، چڑیاں جس کی حفاظت کررہی تھیں۔

اُس کے بعد اُوکلیو نیلے ملک میں رہنے سے ہچکچانے لگا۔اُس کا سارا وجود اُس لڑکی کا مشتاق ہوگیا جسے اُس نے زمین پر سوتے پڑا دیکھ لیا تھا۔اور ایک دن اُس نے بیوی سے اپنا یہ ارادہ بتا کر اسے صدمہ سے دو چار کر دیا کہ وہ اپنے پیدائشی ملک میں لوٹ جائے گا اور محبت کے اس نئے پیکر کو تلاش کرے گا۔ کاس نگی ملول ہوگئی کیونکہ ایک عورت کے دل کو کوئی اور تکلیف اس طرح نہیں چھید سکتی جیسی کہ شوہر کے نظر انداز کرنے کی تکلیف۔اُسے مائل کرنے، راغب کرنے اور لبھانے کے تمام حربے اس نے استعمال کر لئے تاکہ وہ شادی اور وفا کے عہد سے بندھا رہے۔ لیکن وہ سنگدل اور ہٹ دھرم بنا رہا اور تمام بندھنوں کی فکر سے بے پرواوہاں سے رخصت ہوگیا۔

جب وہ روانہ ہوا کاس نگی نے اُس کا پیچھا کیا۔وہ رو رہی تھی اور اس کے آنسو اُس کے پروں کو بھگو رہے تھے اور دھنک کے سارے رنگوں میں لپٹتے جا رہے تھے۔چند بڑے قطرے جو اُس کی لمبی دُم پر اُڑان کے دوران پڑے چمکیلے رنگین دھبوں میں بدل گئے جنہیں کھاسی آج تک ''اُمّت کاس نگی''، یعنی سورج کے آنسو کہتے ہیں۔کاس نگی نے اس سے کہا کہ یہ آنسو اسے ایک نشانی کے طور پر دئے گئے ہیں کہ جہاں کہیں بھی وہ رہے اور جس کسی کو وہ اپنی محبت سے نوازے وہ کاس نگی کو ہرگز نہ بھلا پائے گا جو اُس کی بیویوں میں سب سے حسین اور ایثارمند ہے۔اس طرح اُوکلیو مور اپنے جنگل واپس چلا آیا۔پنچھیوں نے جب اُس کے حسین پَر دیکھے حیرت و ستائش کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ جب اس نے انہیں بتایا کہ وہ ایک دلکش لڑکی کی تلاش میں آیا ہے جو سونے میں ملبوس ہے تو انہوں نے ہنسنا شروع کر دیا اور اب یہ بات صاف ہوگئی کہ جب سرسوں کے کھیت کو ایک عورت کا ہیولہ دیا تو اُس چالاک عورت کا منشا کیا تھا۔ان لوگوں نے اُوکلیو کو دعوت دی کہ چلو تمہیں تمہاری محبت سے متعارف کرادیا جائے جو تمہارا منشا ہے۔اور وہ اسے بڑے اہتمام سے کاسبوئت کے باغ لے گئے۔ وہاں اُوکلیو نے جو دیکھا وہ ایک لڑکی نہ تھی جیسی کہ اس کے تصور میں تھی بلکہ معمولی سرسوں کا کھیت تھا جسے چالاکی سے یہ شکل دی گئی تھی۔اس کی افسوسناک بےعزتی اور تحقیر دیکھنے کے لائق تھی۔اس نے اُڑ کر واپس نیلے ملک جانے کی کوشش کی لیکن اب وہ لمبی اڑان کے لائق نہ رہا تھا۔چنانچہ وہ ہار کر بہت غم انگیز اور افسردہ کراہوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے جنگل کا ہوکر رہ گیا۔

کہا جاتا ہے، ہر صبح مور اپنی گردن آسمان کی جانب اونچی کرتا ہے اور اپنے پر پھیلا کر کاس نگی کی آمد کا استقبال کرتا ہے اور اس کے لئے اب صرف ایک خوشی رہ گئی ہے کہ وہ اپنے پیارے پنکھ پھیلا کر اُن کرنوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے جنہیں کاس نگی ایکبار پھر زمین پر بکھیر دیتی ہے۔

سوفیٹ بنینگ پہاڑ کی داستان

سوفیٹ بنینگ (Sophet Bneng)

شیلانگ کے تیرہ میل شمال میں ایک پہاڑ ہے جو کھلے گنبد کی مانند کھڑا ہے۔پورب میں شیلانگ گوہاٹی ہائی روڈ سے دور نہیں ہے جہاں سے یہ سیدھا نظر آتا ہے۔اس کے نام کا مطلب سوَرگ کا کیندر یا جنت کا مرکز ہے۔

دنیا کی تخلیق کے وقت سے ایک لمبا درخت، آسمان تک پہنچنے والا، اُس پہاڑ پر اُگ آیا۔سوَرگ کے لوگ اسے سیڑھی کی طرح سوَرگ اور دھرتی کے درمیان چڑھنے اترنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔ اُس زمانے میں زمین آباد نہیں تھی لیکن سب طرح کے پیڑ اور پھول کثرت سے اُگا کرتے تھے جس سے زمین بہت خوبصورت اور پسندیدہ جگہ بن گئی اور آکاش والے اپنی خوشی کے لئے گھومنے پھرنے کی خاطر نیچے اتر آتے تھے۔جب انہوں نے دیکھا سوفیٹ بنینگ کے پڑوس کی زمین زرخیز اور خوبصورت ہے تو انہوں نے منافع کے لئے اس پر کھیتی شروع کر دی لیکن وہ کبھی زمین پر رات بھر نہیں ٹھہرتے تھے۔ان کے فیصلے کے مطابق رات کو وہ آکاش پر چڑھ جایا کرتے تھے۔کُل ملا کر سولہ خاندان تھے جو زمین پر کاشتکاری کی تاریخ پر عمل کرتے تھے۔

آسمانی مخلوق میں کوئی ایسا تھا جس نے بہت زیادہ اختیار حاصل کر لیے اور اس نے اپنے بنانے والے (یعنی خدا) کی مخلوق بنے رہنا نہیں چاہا اور اپنے لوگوں پر حکومت کرنے کی خواہش کرنے لگا۔وہ مستقلاً ان موقعوں کی تاک میں رہتا تھا جس سے اس کے ارادے پورے ہوجائیں۔

ایک دن کسانوں کے سات خاندان زمین پر اُتر آئے جبکہ دیگر نو آسمان ہی میں تھے۔جب وہ سات اپنے کھیتوں میں مصروف تھے تو جو حوصلہ مند تھا اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ کر چپکے سے اپنی کلہاڑی لے کر چل پڑا اور اُس نے اس پیڑ کو کاٹ دیا تاکہ وہ سات خاندان لوٹ کر اپنے آسمانی گھر نہ جاسکیں۔

اس طرح انسان زمین پر رہنے آیا اور ان سات خاندانوں میں سے جنہیں کھاسی ''کی ہِنّیو اسکُم'' یا ساتھ جڑیں کہتے ہیں جو اس مہلک دن کو آسمان سے نیچے اترے اُن سے ہی تمام قومیں وارد ہوئیں۔

● تحقیق کرنے پر پتہ چلا سوفیٹ بنینگ کے معنی ہیں ''زمین کی ناف''۔ (مترجم)

گرہن کیسے شروع ہوا

دنیا کی تاریخ کے بہت شروع میں ایک خوبصورت بچی تھی جسے اُس کے ماں باپ کا نام (Ka Nam) کہہ کر بُلاتے تھے۔ وہ ایک سیدھے سادے خاندان میں پیدا ہوئی تھی جو کھاسی کے بڑے جنگلوں کی سرحدوں پر واقع ایک گاؤں میں رہا کرتا تھا۔ بچی اتنی حسین تھی کہ اس کی ماں ہمیشہ اپنے خوف کا اظہار کرتی تھی مبادا کوئی پاس سے گذرتا اجنبی اس کا اغوا کرلے یا اُس پر بُری نگاہ ڈال دے۔ لہٰذا وہ اِس حد تک اُس کی الگ پرورش کرنا چاہتی تھی جس قدر اُس کے نادار حالات میں ممکن ہوسکتا تھا۔ لیکن اُس کا باپ اس بات پر رضامند نہ تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ ایسے احمقانہ خیالات کی پرورش نہ کرے بلکہ اپنی اولاد کو فطری طور پر پالے جیسا کہ دوسرے لوگ اپنے بچے پالتے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو کام سکھائے اور کارآمد بنائے۔ چنانچہ کانام کی پرورش دوسرے بچوں کی طرح کی جانے لگی۔ اُسے کام کرنا سکھایا گیا تاکہ وہ آپ کارآمد بن جائے۔

ایک روز جب وہ اپنی صراحی لے کر کنویں کو جا رہی تھی ایک بڑا شیر جنگل سے آیا اور اُسے اپنے کچھار میں لے گیا۔ دہشت سے وہ تقریباً مر ہی گئی تھی۔ کیونکہ اسے پتہ تھا کہ شیر تمام جانوروں میں سب سے زیادہ ظالم ہوتا ہے۔ اُس شیر کا نام اُوکھلا (U Khla) تھا اور کانام کو بھگا لے جانے کا مقصد تھا کہ وہ اسے کھا لے۔ لیکن جب اُس نے دیکھا وہ کتنی جوان اور چھوٹی ہے اور یہ کہ وہ اُس کی ایک وقت کی خوراک سے بھی کم ہوگی تو اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کے بڑے ہونے تک اُسے اپنے کچھار میں قید رکھے گا۔

اُس نے اسے بڑی احتیاط سے رکھا اور اس کے لئے بہت ساری ایسی نفیس غذائیں لانے لگا جو اس کے ماں باپ کی اوقات سے باہر کی بات تھی۔ اس طرح کانام نے شیر کے ظالمانہ اطوار پر شک کرنا چھوڑ دیا اور اس جنگلی جانور کے اڈے میں آرام سے رہنے لگی اور بڑی ہوکر بے مثال جاذبیت والی لڑکی بن گئی۔

شیر تو صرف اپنے موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ اور جب اس نے دیکھا وہ بڑی ہوگئی ہے تو اُس نے اُسے مارنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ وہ تو کب سے اس خوبصورت دوشیزہ کو کھانے کو بے تاب تھا جسے اُس نے اتنی فکر سے کھلایا پلایا تھا۔ ایک دن جب اس نے آپ کو اپنے

کچھار کی دیکھ ریکھ میں مشغول کر رکھا تھا خود سے بڑبڑانا شروع کر دیا ''اب وقت آ گیا ہے کہ اس انسان بچی کی کھلائی پلائی میں جتنی مشکل سہنا پڑی ہے اُس کا بدل اپنے آپ کو چُکا دوں۔ کل میں اپنے ساتھی شیروں کو بلاؤں گا اور ہم اس لڑکی کی دعوت اڑائیں گے''۔

اتفاق سے اُس ماند کے پاس ایک چوہیا چارہ کی تلاش میں پھر رہی تھی۔ اس نے شیر کو خود سے بڑبڑاتے ہوئے سن لیا جس سے اُسے شیر کے ارادے کی خبر ہوگئی۔ وہ اس کنواری لڑکی کے لئے دُکھی ہوگئی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اکیلی اور بغیر کسی دوست کے شیر کے رحم و کرم پر جی رہی ہے۔ اس لئے چھوٹی چوہیا نے جا کر لڑکی سے کہہ دیا کہ شیر اسے اگلے دن مارنے آئیں گے اور کھالیں گے۔ کانام بڑی مصیبت میں پڑ گئی اور بری طرح رونے لگی۔ اس نے چوہیا سے مدد کی بھیک مانگی کہ وہ اسے کسی طرح یہاں سے نکال دے۔ نرم دل چوہیا نے اُس کی جو مدد ہوسکتی تھی کی۔ سب سے پہلے اس نے لڑکی سے کہا کہ وہ اس بھٹ سے باہر نکل کر جادوگر اُو ہنرو (U Hynroh) کی گُپھا تلاش کرے۔ وہ بڑا دیومینڈک ہے، ساری سلطنت جسے خراج پیش کرتی ہے۔ لیکن وہ ایک بد مزاج اور بدصورت مخلوق ہے جس سے ہر کوئی پرے رہتا ہے۔ عام حالت میں کانام ڈر کے مارے اُس تک نہیں جاسکتی تھی۔ لیکن اُسے جو خطرہ تھا اُس کے خوف نے ہی اسے ہمت دی اور چوہیا کی رہنمائی میں وہ مینڈک کی گپھا تک جا پہنچی۔ جب دیومینڈک نے دیکھا کہ وہ کتنی صاف اور خوبصورت ہے اور اسے معلوم ہوا کہ وہ اُس کے پرانے دشمن شیر کی قیدی ہے تو اُس نے اُسے اپنی حفاظت کی منظوری دے دی۔ اُس نے اُسے ایک مینڈک کی کھال پہنا دی اور جتا دیا کہ وہ کبھی دوسروں کے سامنے یہ کھال نہ اتارے۔ لیکن اُس نے یہ اس لئے کیا تھا کہ لڑکی اُس کے قبضے میں رہے اور وہ اُسے اپنی غلام بنالے۔

چوہیا نے جب دیکھا اس کی خوبصورت دوست ایک مینڈک کے حلیہ کے اندر چھپ گئی ہے تو وہ بہت دکھی ہوئی اور اسے اُو ہنرو کی حفاظت میں بھیجنے کا اسے بہت افسوس ہوا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ جب تک کانام جنگل میں رہے گی اسے مینڈکوں کے ساتھ ان کی غلام بن کر رہنا پڑے گا۔ وہ اسے رازداری سے ایک جادوئی

پیڑ تک لے آئی جو اسی جنگل میں تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا کہ وہ اس پیڑ پر چڑھ جائے جہاں سے وہ شاید آسمان پر پہنچا دی جائے گی۔ وہاں وہ ہمیشہ کے لئے ہر نقصان سے محفوظ ہو جائے گی۔ سو وہ لڑکی جادوئی پیڑ پر چڑھ گئی اور اس نے وہ جادوئی منتر پڑھے جو اسے چوہیا نے سکھائے تھے: ''لمبا ہو جا، پیارے پیڑ، آسمان نزدیک ہے۔ پھیل جا اور لمبا ہو جا''۔ یہ سن کر پیڑ لمبا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ آسمان کو چھونے لگا۔ اور لڑکی نیلی سلطنت میں روشن ہو اٹھی۔ پھر پیڑ اپنی پرانی ناپ پر آ گیا۔

ایک ایک کر کے شیر اور دعوت کے لئے بے چین اس کے دوست کھوہ میں پہنچے۔ جب شیر کو پتہ چلا کہ اس کا شکار غائب ہو گیا ہے تو اس کی ناامیدی اور غصے کی انتہا نہ رہی۔ وہ انتقام کی اونچی اونچی دھمکیاں دینے لگا تا کہ اس کے قیدی کو جس نے بھگایا اسے معلوم ہو جائے۔ اس کی دہاڑیں اتنی اونچی تھیں کہ جنگل کے سارے جانور ڈر سے کانپنے لگے۔ اس کے ساتھی شیر بھی آگ بگولہ ہو اُٹھے کہ انہیں دعوت سے محروم کر دیا گیا۔ وہ 'اُوکھلا' پر پلٹے اور اپنے غصے میں اُسے پھاڑ کر مار ڈالا۔ اس بیچ میں کا نام نیلی دنیا میں مینڈک کی کھال پہنے بے گھر بھٹک رہی تھی۔ وہاں ہر کوئی محلوں اور چمک دمک میں رہتا تھا۔ سب نے اس مکروہ زہریلے مینڈک کو اپنے آستانہ میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ اسے جادوگر اُو ہنرو کی دھمکی کا خیال تھا کہ ہرگز اپنی کھال سے باہر مت آنا۔ آخر کار وہ کاس نگی، سورج کے محل کے سامنے پہنچی جو سدا سے شاندار اور نرم دل واقع ہوا تھا۔ اس نے ترس کھا کر اسے اپنے محل کے باہر ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔

ایک دن یہ سوچتے ہوئے کہ اسے کوئی دیکھ نہیں رہا ہے، لڑکی نے اپنی مینڈک کی کھال اتار کر کنارے کر دی اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے چھوٹے سے کمرے میں آرام کرنے لگی۔ لیکن باہر جانے سے پہلے اس نے احتیاط سے وہ کھال دوبارہ پہن لی۔ اتفاق سے کاس نگی کے بیٹے نے اسے دیکھ لیا۔ وہ بہت شریف نوجوان تھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ ایک بے پناہ خوبصورت لڑکی مینڈک کی کھال میں چھپی ہوئی اس کی ماں کے باہر کے گھر میں رہتی ہے۔ اسے اچنبھا ہوا آخر وہ کیا بری آفت تھی جس نے اُسے اِس قدر مکروہ لباس میں رہنے پر مجبور کر دیا؟۔ اس کے حسن نے اسے مسحور کر دیا اور وہ اس کی محبت میں پڑ گیا۔ اس نے جھٹ یہ انوکھی بات اپنی ماں کو بتا دی اور اسے مجبور کر دیا کہ وہ دیر کئے بغیر اسے محل میں لے آئے اور اسے اپنے بیٹے کی بیوی بنا دے۔ کاس نگی کو تجربہ اور زمانے کی عقل تھی۔ اپنے جوان اور بے تاب جلد باز بیٹے کی بات ماننے سے پہلے اس نے یہ دیکھنا چاہا کہ کیا سچ مچ ایسی کوئی لڑکی ہے جو مینڈک کی کھال کے نیچے رہتی ہے یا اس کا بیٹا کسی برے جادو کے اثر میں آ کر یقین کر بیٹھا ہے کہ اس کے محل کے باہری گھر میں ایسی ایک لڑکی رہتی ہے۔

چنانچہ کاس نگی نے باہری گھر میں مینڈک کی حرکتوں پر نظر رکھنی شروع کی۔ اور ایک دن اسے حیرت کے ساتھ اطمینان ہوا جب اس نے لڑکی کو کھلا دیکھا۔ وہ اس کی غضب کی خوبصورتی اور دلکش چہرے پر حیران تھی۔ لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا اس لڑکی سے رشتے کے لئے دوڑ پڑے۔ اس لئے اس نے حکم دیا کہ وہ اس لڑکی کے قریب نہ جائے یا اس سے اس وقت تک بات نہ کرے جب تک مینڈک کی کھال برباد نہ ہو جائے اور اُس پر پڑا جادو ٹوٹ نہ جائے۔ اب کاس نگی نے خود مینڈک کی حرکتوں پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ ایک دن اس کی نگرانی کا بدل اسے مل گیا جب کا نام مینڈک کی کھال اتار کر سوئی ہوئی تھی۔ کاس نگی چپکے سے رینگتی ہوئی آگے بڑھی اور مینڈک کی کھال کو جلا کر راکھ بنا ڈالا۔ تب سے لڑکی اصل جسم میں نظر آنے لگی اور کاس نگی کے بیٹے کی بیوی بن کر خوش رہنے لگی۔ اب وہ مینڈک دیو کے منتر سے آزاد تھی۔

اُو ہنرو اور کاس نگی کے درمیان ایک پرانا جھگڑا تھا کیونکہ اس نے اسے خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جب اُو ہنرو کو معلوم ہوا کہ اس نے جان بوجھ کر وہ جادوئی کھال برباد کر دی ہے جس میں اس نے لڑکی کو لپیٹ رکھا تھا، تو وہ کاس نگی کے خلاف غصے میں جلنے لگا اور نیلی دنیا کے اوپر چڑھ گیا، اُسے ہڑپنے کے لئے۔ کاس نگی اس کے خلاف بہادری سے ٹکی رہی اور زبردست لڑائی چھڑ گئی جسے ساری دنیا نے دیکھا۔

انسانوں نے وہ جھگڑا دیکھا تو خاموش ہو گئے اس ڈر سے کہ کہیں وہ بلا ان کی سخی اور مہربان کاس نگی پر جیت نہ پالے۔ وہ زور زور سے چلّانے لگے اور صدمے سے اپنے ڈھول بجانے لگے۔ یہاں تک کہ دنیا آوازوں سے گونجنے لگی۔ سب لڑاکوؤں کی طرح اُو ہنرو سچا بزدل نکلا۔ اس نے جب زمین پر ڈھولوں کا شور و غل سنا تو ڈر سے اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے سوچا یہ بڑھتی ہوئی فوج کا شور ہے جو اس سے لڑنے آ رہی ہے۔ اس نے جلدی سے کاس نگی پر سے اپنا زور ہٹا لیا۔ اور نیلی دنیا سے تیزی سے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ اس طرح بے خبری میں انسانوں نے اپنی مہربان کاس نگی کی مدد کر کے ظالم کے ہاتھوں سے نکال دیا۔

اُو ہنرو کا آج تک سورج پر وقتاً فوقتاً حملے کرنا جاری ہے۔ اور کئی ملکوں میں لوگ ان حملوں کو ''گرہن'' کہتے ہیں۔ لیکن پرانے کھاسی جنہوں نے وہ عظیم جنگ دیکھی اسے دیو مینڈک، مہا آدم خور کے طور پر جانتے تھے جو کاس نگی کو محروم کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ جب دنیا میں کسی بڑی شخصیت کی موت قریب ہوتی ہے وہ حملے کرنے کی کوشش کرتی ہے، اس امید میں کہ انسان پہلے سے اپنے کاموں میں اتنا گھرا ہوا ہوگا کہ بچاؤ کے لئے آگے نہ آ سکے گا۔ اس لئے جب کبھی گرہن ہوتا ہے ساری کھاسی دھرتی پر آج تک ڈھول بجانے اور اونچی din اٹھانے کی رسم باقی ہے۔

اکبر الہ آبادی
۱۸۴۶ء — ۱۹۲۱ء

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے

سرکاری دفتر ہو یا عدالت، سیاست کی بساط ہو یا روزمرہ کی ضروریات، مذہب ہو یا ثقافت اکبر الہ آبادی کے اشعار [illegible]
[illegible] اکبر الہ آبادی کے متعدد اشعار [illegible]
اشعار کے حوالے سے یہ سوال [illegible] اکبر الہ آبادی [illegible] ضرب الامثل بن چکے ہیں [illegible]
آبادی کے مصرعے عام زبانوں کا حصہ بن چکے ہیں۔ سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء میں پیدا [illegible]

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے اسپتال جا کر

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اب تو ہے عشق بتاں میں زندگانی کا مزہ
جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائے گا

بتاؤں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

کچھ نہیں کار فلک حادثہ پاشی کے سوا
فلسفہ کچھ نہیں الفاظ تراشی کے سوا

لیڈروں کی دھوم ہے اور فالوور کوئی نہیں
سب تو جنرل ہیں یہاں آخر سپاہی کون ہے

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

میرے ہوس عشق میں کیا کم ہیں منتظر
مجنوں کا نام ہو گیا قسمت کی بات ہے

رضوان کے فرشتے گو ہیں بہت مقدس
شیطان ہی کی جانب لیکن میجارٹی ہے

اس کا گرجا ہے اور اس کے ہیں پادرے
یورپ نے ایشیا کو انجن پہ رکھ لیا ہے

جوانی کی دعا لڑکوں کو [illegible]
بھی لڑکے مانگتے ہیں [illegible]

غضب ہے وہ [illegible]
میں لینا تو اللہ [illegible]

اکبر دبے نہیں کسی [illegible]
لیکن شہید ہو گئے [illegible]

ڈاکا تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

[illegible]

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

موت آئی عشق میں تو ہمیں نیند آ گئی
نکلی بدن سے جان تو کانٹا نکل گیا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ مذہب میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

رہتا ہے عبادت میں ہمیں موت کا کھٹکا
ہم یاد خدا کرتے ہیں کر لے نہ خدا یاد

حسن اکبر ہے تو کیا دل بھی ہے شیدا و سلیم
عشق میں کون بزرگوں کا کہا مانے گا

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

ان کی کمیٹیوں سے ہے پھل کا امیدوار
اکبر درخت سمجھا ہے باتوں کے ڈھیر کو

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق یہ پایا
کہ وہ جامے سے باہر ہے یہ پاجامے سے باہر ہے

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں ریشے کو کیا کریں
مذہب کے جھگڑے چھوڑیں تو پیشے کو کیا کریں

اس قدر تھا کھٹملوں کا چارپائی میں ہجوم
وصل کا دل سے مرے ارمان رخصت ہو گیا

... حق لوگ دیتے ہیں
... جوانی کو جواں ہو کر

... بڑے ہو گئے
... کے ٹکڑے ہو گئے

... سلطان کی طرح ہے
... بیوی کی طرح ہے

دیوی جو انسانوں کے ساتھ رہنے آئی
(شیلانگ چوٹی کی ایک حکایت)

کھاسی پہاڑوں میں ''شیلانگ چوٹی'' سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ گرچہ ہمارے دنوں میں اس کا ایسا نثری نام ہے لیکن قدیم کھاسیوں کے عہد میں یہ پہاڑ ایک مشہور مقام تھا۔ رومان اور اسرار سے بھرا ہوا۔ آتماؤں اور دیوتاؤں کے لئے پوتر۔ اُن دنوں میں یہ پہاڑ اور اس کے شمال کا سارا خطّہ ایک وسیع جنگل ہوا کرتا تھا جہاں راکھشس اور اژدہے رہا کرتے تھے جو کسی بدنصیب شخص کو، جو اگر اُس جنگل میں ایک رات بسر کر لیتا، اپنے منحوس سائے ڈال کر، موذی مرض میں مبتلا کر دیتے تھے۔

وہاں پہاڑ میں ایک دیوتا رہا کرتا تھا۔ اوّلاً قدیم لوگوں کو اس دیوتا کے بارے میں ٹھیک کچھ پتہ نہ تھا۔ اُس کے وجود کا انہیں ہلکا سا علم تھا۔ لیکن ایسا طے نہیں تھا کہ اسے کوئی قربانی دی جانا چاہئے۔ ایک مدت کے بعد کھاسیوں میں ایک بہت عقلمند آدمی نکلا جس کا نام اُوشیلانگ تھا۔ اُسے بھیدوں کو جاننے کی اندرونی نظر ملی ہوئی تھی۔ اُس نے دریافت کیا اور سب کو بتایا کہ پہاڑ کا دیوتا بہت مہان اور طاقتور ہے۔ لوگوں کو اسے بھینٹ نذر کرنی چاہئے۔ اُسی نے ان رسموں کی ادائیگی کے طریقے اپنے پڑوسیوں کو سکھائے۔ دیوتا کا نام افشا نہیں کیا گیا۔ اس وجہ سے لوگوں نے اُسے ''اُولیئی شیلانگ'' کہنا شروع کر دیا یعنی ''اُوشیلانگ کا دیوتا''۔ یہ نام اُس آدمی کے نام پر تھا جس نے اسے پہلی بار خراج ادا کیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اسے ''بھگوان شیلانگ'' کہا جانے لگا۔ تب پہاڑ خود ''شیلانگ پہاڑ'' کہا جاتا تھا اور موجودہ شیلانگ شہر کا نام اسی سے اخذ کیا گیا ہے۔

غالباً شیلانگ دیوتا کھاسی دیوتاؤں میں سب سے زیادہ جانا مانا اور تعظیم کردہ دیوتا تھا اور ہے۔ کیونکہ جینٹیا (Jaintia) پہاڑ کی دور دراز کی چوٹیوں پر اس کے نام کی قربان گاہیں بنائی گئی ہیں جہاں اسے پوجا جاتا اور عزت دی جاتی ہے۔ گرچہ دور دور کے معبدوں میں اسے قربانیاں دی جاتی ہیں لیکن دیوتا کا استھان شیلانگ پہاڑ پر ہے خصوصاً مقدس باغ میں جو چوٹی کی اونچائی پر واقع ہے جو اس ملک میں بہت نامی جگہ ہے۔

روایت کی رُو سے یہ دیوتا بہت شبھ اور مہربان ہستی تھا۔ انسانوں کے لئے بڑا دیالو تھا جو اس کے جنگل میں خطروں اور بیماریوں سے بچے رہ کر شکار کرنے چلے آتے تھے۔ اور اپنے سامنے انسانوں کا ناچنا بھی اسے قبول تھا۔ وہ ان کی مصیبتوں میں ان کی مدد کرتا اور شیطانوں پر قابو پانے میں اُن کے کام آتا۔ اسی نے اُوسوئدنوہ (U Suidnoh) کو اُوتھلین (U Thllen) سے لڑنے اور اس سے جیتنے کی بُدّھی دی تھی۔ اُوتھلین مہان سانپ دیوتا اور چراپونجی کی بدروح تھا۔ شیلانگ دیوتا کی مداخلت سے ہی کاتھیئی (Ka Thei) اور اس کی بہن بے رحم راکھشس اُوکسوئید تنین جانگ (U Ksuid Tynjang) بری نظر سے محفوظ رہ گئے تھے۔

روایت یہ بھی بتاتی ہے کہ اس مشہور دیوتا کی ایک بیوی اور خاندان تھا اور اُس کی کم سے کم تین بیٹیاں کھاسی لوک کتھاؤں میں پہچانی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے خود کو ایک کھاسی کنواری کے وجود میں تبدیل کر لیا تھا اور انسان کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ دو دوسری بیٹیوں نے ہنسی کھیل میں خود کو دو دریاؤں میں تبدیل کر لیا تھا اور آج تک ہمارے ساتھ اسی شکل میں موجود ہیں۔ یہ کہانی ہے اُس دیوی کو جو انسان کے ساتھ رہنے آئی تھی۔

سیکڑوں سال قبل، جو مقام اب پُوم لاکرائی، ہے، وہاں ایک غار ہوا کرتا تھا جسے 'مارائی کا غار' کہا جاتا تھا۔ وہاں ایک لمبی یعنی سیدھی عمودی چٹان کھڑی تھی جس کے گرد گاؤں کے جوان چرواہے کھیلنے آتے تھے۔ وہ کئی سمتوں سے آکر جمع ہوتے تھے اور اپنا وقت اچھی طرح گذارتے، تیراندازی کرتے، بنسی بجاتے اور اپنے ریوڑوں پر نظر بھی رکھتے تھے۔ ہمیشہ یہ کہا جاتا تھا کہ اس چٹان پر انسان کا قدم کبھی نہیں پڑا ہے۔

ایک خاص دن جب وہ چھوکرے معمول کے مطابق اس جانے پہچانے میلے میں آئے، یہ دیکھکر حیران رہ گئے کہ چٹان کی چوٹی پر ایک گوری لڑکی بیٹھی انہیں خاموشی اور حسرت سے تاک رہی ہے۔ بچے اوہام پرست ہونے کی وجہ سے وہ منظر دیکھ کر سہم گئے اور گھبرا کر اپنے گاؤں مائلیم (Mylliem) کو بھاگ گئے۔ اپنے مویشی چھوڑ گئے تاکہ وہ اپنے آپ لوٹ جائیں۔ جب انہوں نے یہ خبر سب کو بتائی، پورا گاؤں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سب مرد جلدی جلدی چوپال میں جمع ہو گئے تاکہ آپس میں وچار کریں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود جا کر اُس بھوت یا سائے کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ کیا جسے بچوں نے دیکھا وہ واقعی کوئی زندہ لڑکی ہے یا پھر ان پر کسی کی بری نظر کا اثر یا جادو چل گیا ہے۔ اُن چھوکروں کی رہنمائی میں وہ پہاڑ کے اس مقام تک پہنچے جہاں چٹان کھڑی تھی اور وہاں، جیسا کہ لڑکوں نے بتایا، چوٹی پر ایک گوری خوبصورت بچّی بیٹھی ہوئی تھی۔

لڑکی نے جو کپڑے پہن رکھے تھے اُن کی عورتوں میں سے کسی کے بھی کپڑوں سے زیادہ امیرانہ تھے۔ اس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ اُس لڑکی کا تعلق کسی امیر گھرانے سے تھا اور وہ اس قدر پیارتھی کہ مرد اس کے حسن سے خیرہ ہو کر اسے منہ کھول کر تکتے تھے۔ جلد ہی ان کے احساسِ پسندیدگی نے خود کو ظاہر کر دیا۔ بہرحال، انہوں نے اس لڑکی کو اس خطرناک صورتِ حال سے بچانے کا منصوبہ بنانا شروع کیا۔ اس عمودی چٹان پر چڑھنا ایک ناممکن بات تھی۔ چنانچہ انہوں نے اُسے پکارا۔ لیکن اُس نے جواب نہ دیا۔ انہوں نے اشاروں سے کہا کہ تم نیچے اُترو۔ لیکن اُس نے جنبش نہ کی۔ وہ لوگ عاجز اور پریشان ہوئے۔

بچانے والوں میں ایک شخص اُومائلیم نگاپ (U Mylliem Ngap) تھا جو اپنی سوجھ بوجھ اور ہمت کی وجہ سے نمایاں تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ لڑکی بہلاوے میں نہیں آرہی تو اُس نے اِسے اُس کے ڈر پر محمول کیا جس کی وجہ سے وہ کھڑی اور پھسلواں چٹان سے نیچے نہیں اتر سکتی تھی۔ لہٰذا اُس نے اپنے چند ساتھیوں کو جنگل بھیجا تا کہ وہ کچھ بانس کاٹ کر لائیں جنہیں جوڑ کر اُس نے ایک کھمبا بنا ڈالا جس پر چڑھ کر چٹان کی اونچائی تک پہنچا جا سکے۔ تب وہ لڑکی کو پکار پکار کے کہنے لگے کہ وہ بانسوں کے اس کھمبے کو تھام لے لیکن وہ بغیر ہلے بیٹھی ہی رہی۔

اُس وقت تک دن ڈھلنے لگا تھا۔ بچّی پھر بھی نہ ہلی اور بچانے والے پریشان ہونے لگے۔ اُسے اس ناقابلِ تسخیر چٹان پر قسمت کے سہارے چھوڑنا اُسے مار ڈالنے سے کیا کم ہوتا۔ کیونکہ لگتا تھا موت اُس کے انتظار میں تھی۔ وہ اونچی آواز میں ماتم کرنے لگے جیسے لوگ اپنے کسی مَرے ہوئے کے لئے کرتے ہیں۔ لیکن لڑکی اسی طرح لاتعلق بیٹھی رہی۔

تبھی اُومائلیم نگاپ نے گُھپا کے قریب جنگلی پھولوں کا ایک گچھا پیدا ہوتے دیکھا۔ اس نے جلدی سے ایک گلدستہ بنایا اور لمبے کھمبے کے آخری سرے پر اسے یوں کس دیا کہ لڑکی اُسے دیکھ پائے۔ پھولوں کو دیکھتے ہی بچّی خوشی سے چیخ اٹھی اور اُس نے اُنہیں پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اُومائلیم نگاپ نے فوراً کھمبا تھوڑا نیچے کر دیا اور وہ اُس کی جانب بڑھی لیکن پھولوں کو تھامنے سے پہلے کھمبا ذرا اور نیچے ہو گیا۔ اِس طرح ذرا ذرا کر کے قدم بہ قدم، جیسا کہ لوگ سانس روکے ہوئے دیکھ رہے تھے، لڑکی زمین پر محفوظ اُتر آئی۔

اُومائلیم نگاپ متفقہ رائے سے اس مہم کا چمپئین مان لیا گیا۔ اس نے لڑکی کو ''پاہ سنتیو'' کہکر پکارا جس کے معنی ہیں ''پھولوں سے پھسلائی گئی''۔ وہ اُسے اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیٹی بنالیا۔ وہ اُس سے شفقت اور محبت سے پیش آتا۔ اور لڑکی بھی اُسے بدلے میں محبت دیتی تھی۔ کاپاہ سنتیو نے بڑی ہو کر اپنے بچپن کے سارے وعدے پورے کئے۔ تب وہ ایک لاجواب حسینہ بن گئی تھی۔ اُس کی شہرت ملک سے باہر چلی گئی۔ وہ پڑوس کی سب لڑکیوں سے بڑھکر نوازش یافتہ اور عقلمند تھی۔ کھاسی کے سب ناچ اور تہواروں کی منتخب لیڈر قرار دی گئی۔ وہ کھاسی لڑکیوں کو ناچنا گانا سکھاتی اور اُسی نے ''کنواریوں کا ناچ'' تہوار کا آغاز کیا جو آج کھاسیوں میں مقبول ہے۔ اُس کا منہ بولا باپ یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ اعلیٰ تمیز و عقل کی مالک ہے، اپنی تمام مشکلات اور گاؤں کے اُمور میں اُس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ وہ ایسے تدبر کا مظاہرہ کرتی تھی کہ دوسرے دیہاتوں کو لوگ اپنے جھگڑے فیصل کرانے اُس کے پاس آتے تھے۔ اُسے ذہین اور ملک کے کسی بھی حاکم سے بہتر تسلیم کیا جانے لگا تو لوگ اسے ''کاسئیم'' (ملکہ یارانی) کہکر بلانے لگے۔

جب اس کی عمر ہوئی، اُومائلیم نگاپ نے اُس کی شادی ایک بہادر و باصلاحیت آدمی سے کرادی جس کا ذکر کھاسی روایات میں ''اُوکونگورنون جِری'' کے نام سے آتا ہے۔ وہ کئی بیٹوں اور بیٹیوں کی ماں بنی جو سب شریف اور باکردار تھے۔

جب اُس کے بچے جوان ہو گئے تو کاپاہ سنتیو نے ایک دن ان سبھوں کو اپنے گھر بلایا اور ان پر اپنے جنم کا راز کھولا۔ وہ ''اُولیئی شیلانگ'' کی بیٹی تھی جو پہاڑ کا دیوتا تھا۔ اُس کے باپ نے اُسے اجازت دی تھی کہ ایک مدت کے لئے انسانوں میں جا کر زندگی گذارے اور آخر کار اب اُس کے اپنی پیدائشی جگہ پر لوٹ جانے کا وقت آ پہنچا تھا۔

اُس کے تھوڑے دنوں بعد کاپاہ سنتیو مارائی کی سمت میں روانہ ہو گئی اور کسی نے کاسئیم کے ساتھ جانے کی ہمت نہ کی کیونکہ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب اُس کی واپسی کا وقت آ گیا ہے۔ اُس دن سے وہ اس جہانِ فانی سے روپوش ہو گئی۔ اُس کے وارث آج تک کھاسی سرداروں یا سئیموں کے دو خاندان کے طور پر مشہور ہیں اور عام طور پر یہ دو خاندان کھائریم اور مائلیم اب تک شیلانگ کے سردار (سئیم) یا سئیموں کے دیوتا کہلاتے ہیں۔

کھاسی اور فیئس اُورائے تونگ کی روایت

[نوٹ: یونانی لفظ Orpheus کے معنی ہیں ''رات کا اندھیرا''۔ اور فیئس (Orpheus) یونانی اساطیر میں ایک شاعر اور موسیقار گذرا ہے جو زیرِ زمین مُردوں کے خداوند ہادیس کو اپنی بانسری کی دھن سے مسحور کر کے اپنی مرحوم بیوی یوری ڈائس کو ایک شرط پر دوبارہ زندہ حالت میں اوپر کی دنیا میں لانے میں کامیاب ہونے ہی کو تھا کہ خود اس کی اپنی غفلت کی وجہ سے وہ شرط ٹوٹ گئی اور اس کی محبوبہ دوبارہ زیر زمین اندھیروں میں روپوش ہو گئی۔ وہ پھر دیوتا ہادیس کے پاس فریاد لے کر گیا لیکن تب اُس پر دروازے بند کر دیے گئے۔ مترجم]

صوبۂ آسام کے خاص شہر شیلانگ کے کچھ شمال میں ایک زرخیز اور خوشگوار پہاڑ ہے جو ''رائے تونگ پہاڑ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ لوک روایت مشہور ترین روایات میں سے ایک ہے کہ یہ وہ امتیازی جگہ ہے جہاں ستی یعنی ہندوؤں میں بیوی کی قربانی کی رسم شروع ہوئی۔ حکایت اس طرح ہے:

بہت زمانوں قبل ایک بڑا راجہ (سئیم) ہوا کرتا تھا جو بڑے خطّوں پر راج کرتا تھا اور جس کا راج نشان کئی قبیلوں اور لوگوں پر حکمرانی کرتا تھا۔ اتنے مہان راجہ کی بیوی مہادیئی بڑی حسین عورت تھی۔ اس کی کاٹھی کھڑی اور چست و توانا تھی اور اس کی جنبشیں موسم گرما کی ہواؤں اور ناریل کے نرم پیڑوں کی جنبشوں کی طرح لچکدار اور شاندار تھیں۔ اُس کے بال لانبے

اور ہوا میں اُڑ اُڑ کر بادلوں کی چادر کی طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے تھے۔ اس کے دانت خوبصورت سیپیوں کی مالا جیسے تھے۔ ہونٹ قیمتی مر جان جیسے سرخ اور لاسوبون پھول کی طرح معطر تھے۔ چہرہ کسی دیوی کی طرح روشن تھا۔ اس مشہور شاہی جوڑے کے نام آئندہ نسل میں منتقل نہیں ہوئے ہیں۔

ایک دور گذر اجب صوبہ کے امور کی وجہ سے سئیم (راجہ) کو ایک طویل مدت کے لئے گھر سے دور رہنا ضروری ہوگیا۔ اُس وقفہ میں اُس نے گاؤں کا انتظام چلانے اور اپنے گھر کے بندوبست کی خاطر کچھ نائب مقرر کئے۔ مہادیئی جو سئیم کی دلاری تھی، کو خود اُس پر اور سئیم کے اپنے اراکینِ خاندان پر چھوڑ دیا گیا۔ جب سارے انتظامات تسلی بخش ہوگئے تو وہ اپنی رعایا کی نیک خواہشات لئے اپنے لمبے سفر پر روانہ ہوگیا۔

سئیم کی رعایا میں ایک غریب کنوارا تھا جسے آدھے حواس کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ میلے چیتھڑوں میں ملبوس رہ کر اپنے دن گاؤں میں گھوم پھر کر گذارتا تھا۔ اُس کا سر اور چہرہ گشتی فقیر کی طرح چھائی میں اٹا رہتا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے آپ سے بڑبڑاتا رہتا تھا اور اپنی لاچار اور بے یار و مددگار حالت پر افسوس کرتا تھا۔ اُس کا نام ''اُورائے تونگ'' تھا۔ پہلے وہ ایک خوش باش اور اچھی نگرانی میں رہا ہوا لڑکا تھا۔ رشتہ داروں سے اسے محبت ملتی تھی اور اُن سے گھِرا رہتا تھا۔ اچانک گاؤں کو ایک خطرناک وبا نے آلیا اور اُس کے سارے خاندان کو اڑا لے گئی اور اسے یتیم اور اکیلا چھوڑ گئی۔ کوئی گذر بسر کا ذریعہ نہ رہا۔ اور بیماری کی حالت میں اُس کے بستر کے سرہانے 'یا اگر نوبت آجاتی تو انتم سنسکار کے لئے' ایک رشتہ دار نہ بچا۔ صدمہ اور افسوس کے زیر اثر اُورائے تونگ نے عہد کیا کہ زندگی کے تمام دن اپنے رشتہ داروں کی موت کا ماتم کرتے گذارے گا۔ اس طرح تن پر چیتھڑے پہنے وہ گاؤں میں ماتم کرتا پھرتا۔ پڑوسیوں کو اُس کی قسم کا علم نہ تھا۔ انہوں نے سمجھا صدمے نے اُس کا سر گھما دیا ہے۔ وہ اس سے بے وقوف جیسا برتاؤ کرنے لگے۔ اس پر تاسف کرتے اور اُسے بھیک دیتے۔ اُس کی حالت اتنی ناقص و رنجیدہ ہوگئی اور لباس اس درجہ تار تار ہوگئے کہ وہ ملک میں ایک ضرب المثل بن گیا۔ آج بھی کسی کو انتہائی غریبی میں دیکھکر کھاسی لوگ مثال دینے کے لئے کہتے ہیں ''اتنا غریب جیسے اُورائے تونگ''۔

رات کو بہرحال اُورائے تونگ خود کو اپنی اس کڑی پر تنگیا سے آزاد سمجھتا اور جب وہ اپنے گاؤں کے باہر اپنے کمزور سے کمرے میں سُستانے بیٹھتا تو تن سے اپنے چیتھڑے اتار کر عمدہ پوشاک پہن لیتا اور گھنٹوں اپنی شراتی (بانسری) بجاتا رہتا جو کھاسیوں میں آج کے دن تک رائج ہے۔ وہ پیدائشی سنگیت کار تھا اور مستقل ریاض نے اسے ایک پکّا نے نواز بنا دیا تھا۔ کوئی بانسری اتنا میٹھا اور ٹھاٹھ دار سُر نہیں نکال سکتی تھی جتنا کہ اُورائے تونگ کی شراتی۔ جس وقت وہ اُسے خفیہ طور سے رات کی ساعتوں میں بجاتا سارا گاؤں سویا ہوتا تھا۔

جو دھنیں وہ بجاتا اس قدر ہوش رُبا ہوتیں کہ اکثر وہ خود اپنے اطراف سے غافل ہوجاتا اور اپنے ہی سنگیت کی لطافت میں خود کو کھو دیتا۔ اُس کا بدن پسپا اور خالص نشاط و انبساط سے کانپ کانپ جاتا۔ اپنی شراتی سے وہ گرہ پر گرہ لگاتا چلا جاتا۔ اس کے باوجود وہ اتنا محتاط تھا کہ کسی پڑوسی کو کبھی شک نہ ہوا کہ وہ ایسی نعمت کا مالک ہے۔ کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ یہ بات سب کو معلوم ہوگئی تو اس کی قسم پوری ہونے میں رکاوٹ واقع ہوسکتی ہے۔ ایک رات مہادیئی بے چین تھی اور سو نہیں پا رہی تھی۔ بیداری میں اُسے ہوا کے دوش پر اُڑتے سب سے میٹھے سنگیت کے مدھم سُر سنائی دیے۔ اسے خیال ہوا یہ ان پریوں کی طرف سے آرہے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جنگل کے کچھ حصوں میں رہتی ہیں۔ وہ سُروں میں محو اس سنگیت کو سنتی رہی۔ یہاں تک کہ آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ سنگیت رکا تو بڑی تنہائی کا احساس اُس پر چھا گیا جو اتنا شدید تھا کہ اسے بیان کرنے کی ہمت خود میں جُٹا نہ پائی۔ گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ لیکن اس کا خیال کہیں دور بھٹک رہا تھا۔ وہ رات کا انتظار کرنے لگی۔ اسے امید تھی کہ سنگیت پھر اُس تک اُڑ کر پہنچے گا۔

اگلی رات کو اور پھر کئی راتوں میں مہادیئی، لیٹی رہ کر کسی ساز سے نکل کر ہوا کی لہروں پر بہہ کر آتے نرم میٹھے سنگیت کو سنتی رہتی۔ یہاں تک کہ وہ تصور کرتی کہ کمرہ کچھ خوبصورت ہستیوں سے بھر گیا ہے جو ایسی میٹھی دھنیں گا رہے ہیں جنہیں شاید ہی انسانی کانوں نے کبھی سنا ہو۔ صبح تڑکے جب یہ سلسلہ ختم ہوتا تنہائی اور اکیلے پن کا احساس بہت شدید ہوجاتا۔ اُس کا دماغ اس پُر اسرار سنگیت کی بھاؤنا میں ڈوب جاتا۔ گرویدگی بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ اُس نے مہادیئی کو بے قابو کردیا اور وہ یہ جاننے کے لئے بے بس ہوگئی کہ یہ آوازیں کہاں سے آتی ہیں۔ ایک رات وہ اپنے کمرے سے ان خفیہ طور سے آنے والی آوازوں کی سمت میں نکل پڑی۔ گاؤں سے ہوکر وہ جہاں پہنچی اُورائے تونگ کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تھی جس سے سنگیت نکل رہا تھا۔

مہادیئی کا دل متاثر ہوا۔ اُس نے سوچا کہ نزاکت اور افسوس کی ماری پریاں اپنے سنگیت سے اس غریب بے وقوف کا جی بہلانے اور اسے آرام دینے آتی ہوں گی۔ وہ وہاں کھڑی ہوکر سننے لگی۔ جو سُر وہ اپنے کمرے میں بہت مدھم سن پاتی تھی اب اچھی طرح سن پا رہی تھی اور وہ اُس پر یوں اثر ڈال رہے تھے گویا اُس کا سارا وجود اُڑا لے گئے ہوں۔

صبح سے پہلے اچانک آوازیں بند ہوگئیں۔ اور مہادیئی رینگتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ کسی نے اسے دیکھا نہیں۔ اُس کے بعد ہر رات کو وہ اپنے گھر سے غائب ہوکر سنگیت سننے چلی جاتی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ پریوں کا سنگیت ہے جو رائے تونگ کی جھونپڑی کے باہر بجتا ہے۔

ایک رات سنگیت معمول سے زیادہ طاقتور

محسوس ہوا۔ مہادیئی نے اور قریب جا کر دروازے کی ایک درز سے جھانک کر دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ خلافِ گمان وہاں پریوں کے بجائے اُورائے تونگ، جسے لوگ بے وقوف کہتے تھے، بانسری بجا رہا تھا۔ لیکن یہ رائے تونگ اس سے بہت الگ تھا جسے گاؤں میں دیکھنے کی وہ عادی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ وہ بڑے نفیس کپڑوں میں ملبوس تھا اور اس کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔ اس کا بدن جنگلی سنگیت کے آہنگ میں سرشار ہو کر شان دار جنبشوں کے ساتھ رہ رہ کر تھرک اٹھتا تھا۔ وہ یہ منظر دیکھ کر گونگی بنی کھڑی رہی۔ سنگیت نے اُس پر وہ جادو کیا کہ وہ شادی پر اپنے شوہر سے کئے گئے وعدوں کو بھول کر اُورائے تونگ کی گہری اور اٹوٹ محبت میں پڑ گئی۔ وقت گذرتا گیا۔ مہا دیئی مخفی طور پر اُورائے تونگ کی جھونپڑی تک جاتی رہی۔ اس کی شراتی (بانسری) کی گرویدگی سے بڑھ کر اس کا جذبۂ محبت اُسے کھینچ کر لے جاتا تھا۔ پہلے تو اُورائے تونگ اس سے بے خبر تھا کہ اس کی مخبری کی جا رہی ہے لیکن جب اس نے مہادیئی کو دریافت کیا تو بہت پریشان ہوا۔ اُس نے اِس بات پر جرح کرنے کی کوشش کی کہ اُس کے مرتبہ سے اونچا کوئی شخص اس قدر سخت گیری کے ساتھ اُس سے ملنے آئے۔ لیکن مہا دیئی نے اُس کے تمام جوازوں کو رد کر دیا اور اُس کے لئے اُس کی محبت اور اس کی شخصیت کے حسن نے اُورائے یونگ کے اندر ایسے ہی احساسات جگا دئے اور وہ اُس کے فسق اور بے لگام محبت کا شکار ہو گیا۔

مہینے گذرتے رہے اور سئیم کی واپسی کا وقت آنے لگا۔ لوگوں نے اس کی واپسی کے جشن کی تیاریوں کا ذکر شروع کر دیا۔ ہر شخص، سوائے مہادیئی کے، زیادہ سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ دیکھا گیا کہ جسے سب سے زیادہ دلچسپی ہونی چاہئے تھے وہی سب سے بے فکر معلوم ہو رہا ہے۔ لوگ اُسے اس قدر سرد اور لاتعلق پا کر حیران تھے۔ لیکن ایک دن وجہ سامنے آ گئی۔ جب اعلان ہوا کہ مہادیئی کو ایک بیٹا پیدا ہوا ہے اور اس کے ذمہ داروں نے اسے دربار کے ایک کمرے میں تالا لگا کر سئیم کے انتظار میں بند کر رکھا ہے تو اُس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور کوئی صفائی پیش نہ کی۔ لیکن جب اُس سے کہا گیا کہ وہ بچے کے باپ کی شناخت بتائے تو وہ بالکل چُپ رہی۔ جب سئیم لوٹا اور اپنی بیوی کی بے وفائی کا چرچا سنا وہ شرم اور صدمے سے گر پڑا۔ اس نے قسم کھائی کہ قانون کی رو سے وہ اس شخص پر سخت ترین جرمانہ عائد کرے گا جس نے اس کی عزت کو تاراج کیا ہے لیکن کوئی بہلاوا، پھسلاہٹ کوئی دباؤ مہادیئی کے منہ سے اس آدمی کا نام نہ نکلوا سکا۔

صوبہ کی بھلائی اور سئیم کی تسکین کے لئے ضروری تھا کہ مجرم کا پتہ چلے۔ لہٰذا سئیم نے سارے علاقے میں سزائے موت کا اعلان کروا دیا کہ تمام مرد عظیم صوبائی دربار میں حاضر ہوں جہاں سئیم اور اس کے وزیر ایک ساتھ بیٹھ کر دریافت کریں گے کہ بے وفا مہادیئی کے بچے کا باپ کون ہے۔ دربار کی تاریخ میں اتنا بڑا مجمع راجہ (سئیم) کے آگے جوانوں اور بوڑھوں کا، کبھی نہ دیکھا گیا تھا۔ لوگوں کو اُس کی طے کردہ آزمائش سے گذرنا تھا۔ جب سب جمع ہو گئے تو سئیم نے حکم دیا کہ ایک چٹائی لا کر بیچ میں بچھا دی جائے اور بچہ اُس پر لٹا دیا جائے۔ اس کے بعد اس نے ہر مرد کو حکم دیا کہ وہ مجمع کے سامنے چٹائی کے گرد چکر لگائے اور چکر لگاتے ہوئے بچے کو ایک کیلا پیش کرے۔ جیسا کہ عقیدہ تھا، بچے کا فطری رویہ اُسے اپنے باپ کے ہاتھ سے کیلا قبول کرنے پر مجبور کرے گا۔ وہ کسی اور سے کیلا نہیں لے گا۔

ایک ایک کر کے ہر مرد نے یہ عمل کیا لیکن بچے نے (کسی کے تئیں) کوئی اشارہ ظاہر نہ کیا۔ سئیم اور اس کے وزیر پریشان اور الجھے ہوئے تھے۔ انہوں نے جاننا چاہا کون آدمی پیشی میں حاضر نہیں ہوا۔ لیکن جب نام پکارے گئے تو لوگ پورے نکلے۔ ہجوم میں سے کوئی چلّایا ''اُورائے تونگ'' جس پر بہت سارے لوگ ہنس پڑے کیونکہ اسے کوئی بھی ہوش مند نہیں مانتا تھا۔ مذاقاً کئی آوازیں ابھریں ''اُسے بلواؤ''۔ کچھ دوسروں نے کہا ''ایسی کم اصل مخلوق کو کیوں تکلیف دیتے ہو؟ وہ محض کتّا یا ایک چوہا ہے''۔ اس طرح دربار بٹ گیا۔ لیکن وزیر سب سے بدبخت کو بھی آزمائے بغیر چھوڑنے پر رضامند نہ تھے۔ انہوں نے اُسے طلب کیا اور دوسرے مَردوں کی طرح اسے بھی آزمائش سے گذرنے کو کہا۔

جب سئیم کے قاصد جھونپڑی پر پہنچے انہوں نے اُورائے تونگ کو ہمیشہ کی طرح گندے چیتھڑوں میں ملبوس خود سے بڑبڑاتے پایا۔ اُس کے چہرے پر راکھ ملی ہوئی تھی۔ وہ فوراً کھڑا ہوا اور ان کے پیچھے دربار تک چلا آیا۔ تو اُس پر لوگ افسوس کرنے لگے کیونکہ وہ اس قدر غمگین، مسکین اور غیر محفوظ دکھائی دے رہا تھا کہ اس جیسے کو ایسی آزمائش سے گذارنا شرمناک بات ہوتی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کیلا تھمایا گیا اور اسے چٹائی سے گذرنے کے لئے کہا گیا۔ اُس نے چاروں طرف کھڑے خوش پوشاک لوگوں کی طرف دھیان نہ دیا۔

ایک بہت بڑی افراتفری ہوئی جب راز کھلا۔ اور سئیم یہ جان کر شرمندگی اور ذلّت محسوس کرنے لگا کہ ایسا نامناسب اور غریب آدمی اُس کی حسین بیوی کا عاشق نکلا!۔ درباری اس واردات پر سخت حیران تھے۔ ان میں سے کئی نے دیوتا کا شکر ادا کیا جس نے واقعات اس طرح ترتیب دیے اور قصوروار کو بالآخر فیصلے تک پہنچا دیا۔ سئیم نے اپنے وزیروں کو حکم دیا کہ وہ فیصلہ سنائیں اور انہوں نے بہ یک آواز اعلان کیا کہ اسے جلا کر مار دینا چاہئے اور اس کے سنسکار کی کوئی رسم ادا نہیں کی جائے اور یہ کہ کوئی ہاتھ اس کی استھیوں کو دفنانے کے لئے نہ سمیٹے۔ تمام دربار اس فیصلے پر متفق تھا کیونکہ قانون اور حکم ایسا ہی تھا۔

اُورائے یونگ نے لاتعلقی سے اس فیصلے کو لیا۔ گویا یہ سب وہ پہلے سے جانتا ہو اور اپنے مقدّر سے سمجھوتہ کر چکا ہو۔ لیکن اس نے ایک انوکھی بات کی۔

اُس نے اپنی چتا خود تیار کرنے اور اپنا نوحہ آپ گانے کی اجازت چاہی۔ سئیم اور سب لوگ اسے دھاڑیں مار کر رونے کے بجائے ایسے دوٹوک لہجے میں بات کرتے سن کر حیران ہوئے۔ اُس کی درخواست پر کسی نے کوئی اعتراض نہ اٹھایا۔ لہٰذا اُسے اپنی ارتھی خود بنانے اور اپنا نوحہ گانے کی اجازت دے دی گئی۔

اس کے مطابق اُورائے تونگ اگلی صبح جلدی اٹھا اور اس نے سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر جمع کیا اور اس احتیاط سے اسے بچھایا کہ سئیم اور دوسرے مہمان لوگوں کی چتا سے بھی بڑی چتا بنا ڈالی۔ چتا تیار کر کے وہ اپنی اکیلی جھوپڑی میں واپس آیا اور خود کو گندے چیتھڑوں سے آزاد کر کے نفیس کپڑوں میں ملبوس کیا جو وہ رات کے اوقات میں پہنتا تھا جب وہ سنگیت میں غرق ہو جاتا تھا۔ تب اس نے اپنی شراتی ہاتھ میں لی اور غضبناک محویت میں اپنی چتا کی جانب بڑھتے ہوئے وہ شراتی بجا رہا تھا۔ اور اُس کے نوحہ کی آواز ہوا کی مدد سے گاؤں کے ہر باسی تک پہنچ رہی تھی۔ دھن اتنی خوبصورت اور مسحور کن، جنگلی دل سوزی و جاں گذرای اور رنج و الم سے اتنی بھرپور تھی کہ اس نے ہر دل کو ہلا کر رکھ دیا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اُورائے تونگ کے بدلے ہوئے حلیے پر سب حیران تھے اور ایسے شاندار اور پُر اسرار سنگیت پر بُری طرح فدا ہوئے۔ انہوں نے ایسا سنگیت پہلے کبھی نہ سُنا تھا جس نے ہر ایک کو اپنے جادو سے گرفت میں لے لیا۔ جب مجمع چتا تک پہنچا اُورائے تونگ جھکا اور ایک پل کی دیر کئے بغیر سوکھی لکڑیوں کو جلا دیا۔ پھر ایک بار اور اس نے شراتی بجانا شروع کی اور چتا کے گرد تین پھیرے لگائے اور چکر لگاتے ہوئے ایسی غم ناک اور حزنیہ دھنیں بجائیں کہ سننے والے اس کی ہمدردی میں ماتمی پکاریں لگانے لگے۔ ملک کے سب سے بڑے لوگوں کے ماتم میں اٹھائی جانے والی آوازوں سے زیادہ پُرخلوص وہ ماتمی آوازیں تھیں جو بدنصیب اُورائے تونگ کی ہمدردی میں اٹھائی جا رہی تھیں۔ تیسرے پھیرے کے آخر میں اُورائے تونگ نے اچانک اپنا سنگیت روک کر شراتی کو اُلٹا زمین میں گاڑ دیا اور جلتی چتا میں خود کو جھونک دیا اور فنا ہو گیا۔

یہ واقعات جب رونما ہو رہے تھے مہادیئی اپنے کمرے میں قید تھی۔ باہر جو کچھ ہو رہا تھا اس کی سرگوشی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن اس کا دل اپنے عاشق کے اندیشے سے بیٹھا جا رہا تھا اور جب اس نے شراتی کے سُر سنے تو سمجھ لیا کہ یہ اُورائے تونگ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ اب راز فاش ہو چکا ہے اور اُسے اس کی چتا تک بھیجا جا رہا ہے۔ پہلے کی طرح اُسے لگا شراتی کے سُر اسے بلا رہے ہیں۔ اور تقریباً ایک مافوق الانسان کی سی قوت کے ساتھ اس نے اپنے قید خانے کا دروازہ کھول ڈالا۔ اس کے جوش و جذبہ میں اس قدر طاقت تھی۔ اس نے دیکھا اس کا بیٹا کوڑیوں کی مالا سے کھیل رہا ہے تو بڑی پھُرتی سے اس نے وہ مالا ایک بلّی کے بچے کے پاؤں سے باندھ کر کسی چیز سے کس دی تا کہ جب وہ کمرے میں حرکت کرے اور کوڑیوں کی چھن چھناہٹ پیدا ہو تو باہر کے لوگ سمجھیں کہ مہادیئی کمرے میں چل رہی ہے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے پہاڑ کی طرف شراتی کے سنگیت اور ماتمی آوازوں کی سمت میں بھاگی۔ جب وہ چتا کو پہنچی تبھی اُورائے تونگ نے جان لیوا چھلانگ لگا لی تھی۔ اس نے ثابت قدمی سے ماتمی ہجوم کو چیر کر اپنی راہ بنائی اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کے اقدام کا قیاس کر پائے اس نے بھی چتا کے شعلوں میں چھلانگ لگا دی تا کہ اپنے عاشق کے ساتھ وہ بھی مر جائے۔

گاؤں کے تمام لوگوں میں سے سئیم اکیلا دل گداز نوحہ سننے کو موجود رہ گیا تھا۔ وہ بدمزاجی اور شرم ناک ظالمانہ پن سے اپنے کمرے میں بیٹھا اپنے شدید سانحہ پر غور کر رہا تھا۔ جب مہادیئی شعلوں میں تُھکی، سئیم کی خواب گاہ میں ایک انوکھی بات رونما ہوئی۔ اس کی بیوی کے سر کا دوپٹہ (تاپوہ) پُراسرار طریقے سے اُڑ کر آیا اور اس کے قدموں میں گر پڑا حالانکہ اُس وقت اتنی ہوا بھی نہ تھی کہ ایک پتّے کو اڑا کر لا سکتی۔ سئیم نے اسے دیکھا تو کہا ''یہ علامت ہے اس بات کی کہ میری بیوی مر گئی ہے۔ پھر بھی مہادیئی کے کمرے سے آوازیں سن کر اُس نے چاہا کہ بے توجّہی سے کام نہ لے۔ بہرحال وہ تحقیق کرنے اٹھا اور جب اس نے کمرے کا دروازہ کھولا جہاں مہادیئی قید تھی تو کمرہ خالی نظر آیا۔ بس ایک بلّی وہاں تھی جس کے پاؤں سے کوڑیوں کی مالا بندھی ہوئی تھی۔ سئیم فطری طور پر سمجھ گیا کہ وہ کہاں گئی ہوگی اور مزید کسی باعثِ رسوائی واردات کو رونما ہونے سے روکنے کے لئے پہاڑ پر چتا کی طرف لپکا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہاں اُسے صرف مہادیئی کی چھائی ملی۔ عاشق کے لئے مہادیئی کی بے مثال محبت کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی اور سب ملکوں کے مردوں اور عورتوں کے دماغ اس نے ہلا دیے۔ بھارت کی پتی ورتاؤں نے یہ خبر سن کر ایک دوسری سے کہا ''ہمیں ایک بے وفا عورت کے ناپاک جذبے کو شادی شدہ عورتوں کی محبت سے زیادہ مشہور نہیں ہونے دینا چاہئے۔ اب سے جب ہمارے شوہروں کی موت ہوگی تو اُن کی چتاؤں میں ہم اپنے شریر جھونک دیں گے جس سے ہماری محبت اور وفا ثابت ہو سکے''۔ اس طرح بھارت کے کئی حصوں میں پتنیوں کی ستی (بلی) کی رسم شروع ہوئی۔

کھاسی لوگ شراتی (بانسری) کے غم اور سوگ کے اظہار کی صفت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کے بعد سے انہوں نے اس ساز کو میّت سوزی کے وقت نوحہ بجانے کے لئے اپنا لیا۔ اُورائے تونگ کی شراتی جسے اس نے چتا میں چھلانگ لگاتے ہوئے زمین میں الٹا گاڑ دیا تھا، جڑ پکڑ لی اور اُس میں سے بانسوں کا ایک گُچھا اُگ آیا جو اور بانسوں سے الگ قسم کا ہوتا ہے جن کی شاخیں اوپر کے بجائے نیچے کو جاتی ہیں۔ آج تک عموماً دیکھا جاتا ہے کہ رائے تونگ پہاڑ پر ایسے بہت بانس پائے جاتے ہیں جو نیچے کو اُگتے ہیں۔

❑❑❑

خاندان اجتہاد اور سلطان المدارس

مرزا جعفر حسین
۱۸۹۹ ۱۹۸۹

مولوی سید دلدار علی کے خانوادہ کو 'خاندان اجتہاد' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس گھرانے کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ شہر میں ایک شیعہ مجتہد کا سب سے زیادہ پرانا خاندان یہی ہے جہاں سے شیعیت کی ملک بھر میں تبلیغ وترویج ہوئی تھی اور جس کی دینی خدمات تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ زرین حروف میں لکھے رہیں گے۔ مولوی دلدار علی اپنے آبائی وطن قصبہ نصیرآباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ یہاں فرنگی محل میں سلسلۂ درس جاری رکھ کر فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ وہ زمانہ آصف الدولہ کا تھا۔ گو کہ غازی الدین حیدر کے عہد تک محکمۂ قضا و افتای کلیۃً فرنگی محل کے مفتیوں کے اقتدار میں رہا تھا لیکن عہد آصفی ہی میں ان کے وزیر سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نے شیعہ عقیدہ کو درباری حیثیت دے کر ایک شیعہ عالم مرزا محمد عسکری کو بھی مفتی دربار مقرر کرا دیا تھا۔ مرزا محمد عسکری کا مسلک اخباری تھا۔ وہ اصولی شیعہ نہیں تھے۔ اس لئے انہیں نماز جمعہ و جماعت سے سروکار نہیں تھا۔ لہٰذا مولوی دلدار علی کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد وزیر موصوف نے سند اجتہاد حاصل کرانے کے لئے عراق بھجوایا۔ جہاں سے وہ پانچ برس کے بعد اجازہ لے کر لکھنؤ واپس آ گئے۔ آصف الدولہ کے دربار میں وہ بڑے عزت و احترام کے مالک تھے لیکن انہوں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ غفرانمآب کا خطاب بھی ان کو بعد ممات ملا تھا۔ وہ اپنا سارا وقت تعلیم و تدریس اور ترویج و تبلیغ دین میں صرف فرماتے تھے۔ انہیں مساعی جمیلہ کی برکتوں سے ان کی اخلاف میں ان کے پانچ بیٹے اور تیرہ پوتے مسند علم و فضل کے مالک ہوئے تھے۔ ان آخر الذکر اخلاف میں آٹھ صاحبان اپنے عہد کے مجتہد اعظم تھے۔ اجتہاد کا یہ سلسلہ خاندان میں اب تک برقرار ہے۔

مولانا دلدار علی نے دربار شاہی میں کوئی منصب حاصل نہیں کیا تھا لیکن آصف الدولہ کی والدہ یعنی بہو بیگم صاحبہ نے ان کو وافر آمدنی کی معافی عطا کر دی تھی جو ان کی ضرورتوں کے لئے بہت کافی تھے۔ اس لئے وہ پورے اطمینان اور سکون خاطر کے ساتھ اپنے معمولات بجالاتے رہے۔ وہ عراق سے ادبی ذوق بھی لائے تھے جس کا فرنگی محل میں فقدان تھا۔ ان کی اسی اہلیت نے شعر و ادب اور فن عروض میں لکھنؤ کا پایہ بہت بلند کر دیا تھا۔ ان کے یہ گرانقدر اثرات قدیم لکھنؤ کے آخری دور تک برقرار رہے تھے جس کے نتیجہ میں مفتی محمد عباس کے ایسے بلند پایہ فارسی شعراء و ادیب اجڑتی ہوئی ہماری پرانی محفل فکر و فن کو جگمگاتے رہے تھے۔ ترویج دین کے سلسلہ میں مولوی دلدار علی وہ پہلے عالم دین تھے جنہوں نے شیعوں میں نماز جمعہ باجماعت پڑھائی تھی۔ اس کے پہلے غالباً سارے ملک میں اور یقیناً شمالی ہند میں شیعوں کی باجماعت نماز جمعہ کہیں نہیں ہوتی تھی۔ وہ نماز جماعت پڑھاتے اور بعد میں موعظہ فرماتے تھے۔ ان مواعظ میں سب سے پہلے انہوں نے شیعیت اور تصوف میں حد فاصل قائم کرائی تھی۔

'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'

اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی ساتویں کڑی کے طور پر مرزا جعفر حسین کی کتاب 'قدیم لکھنؤ کی آخری بہار' سے ایک تحریر 'خاندان اجتہاد اور سلطان المدارس' حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

دوسری طرف مولوی دلدار علی نے امام حسین کی عزاداری کے اس رجحان کو جو شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے عہد میں پروان چڑھ رہا تھا، فروغ دینے کی ہر امکانی کوشش کی۔ عزاداری کے رائج الوقت رسم و رواج میں انہوں نے شہنائی، روشن چوکی اور ماہی مراتب کو جلوسوں میں شامل کرنے کی ممانعت کی اور بانک و پٹے کے کرتبوں کے خلاف متانت قرار دیا اور ان سب کے بجائے جنگی باجے کی اجازت دی اور جلوسوں میں مہندی، علم، تعزیوں اور ذوالجناح کی شبیہوں کے اضافے کرائے۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کے امتناعی احکام پر زیادہ عمل نہیں ہو سکا اور وہ تمام ممنوعات مثلاً روشن چوکی، ماہی مراتب وغیرہ بدستور برقرار رہے البتہ شبیہوں کی تعداد میں روزافزوں بہتات ہوتی رہی۔

مولانا دلدار علی نے غازی الدین حیدر کے عہد میں شاگردوں کی ایک کثیر تعداد اور چار صاحبزادے چھوڑ کر انتقال کیا تھا۔ ان کے ایک صاحبزادے ان کی حیات ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ باقی ماندہ چار بیٹوں میں ایک ہجرت کر کے اپنے والد کی حیات ہی میں عراق چلے گئے تھے اور وہیں انتقال فرمایا۔ ایک صاحبزادے سید حسن بھی اپنے والد کی وفات کے تقریباً چار سال بعد ہی رحلت کر گئے تھے۔ اس طرح انہوں نے صحیح معنوں میں اپنے سبس ے بڑے بیٹے سید محمد اور سب سے چھوٹے سید حسن کو اپنا جانشین چھوڑا تھا۔ سید محمد تاحیات خود سلطان العلماء اور قبلہ و کعبہ کہلاتے تھے اور بعد وفات 'رضوان مآب' کے خطاب سے ملقب ہوئے۔ سید حسن اپنی زندگی بھر سید العلماء، میرن صاحب یا چھوٹے قبلہ کہلاتے تھے اور انتقال کے بعد 'علیین مکان' سے ملقب ہوئے۔ ان دونوں بھائیوں کو اودھ کے شاہی درباروں میں بڑا اقتدار حاصل تھا بالخصوص امجد علی شاہ کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ان مجتہدوں کے احکام پر ہمیشہ سر تسلیم خم کر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں ایک محکمۂ شرعیہ قائم کر کے غفرانمآب کے بڑے صاحبزادے مولانا سید محمد کو عدلیہ، پولیس، آبکاری، تعلیم اور امور خیر کے شعبہ جات کا نگراں مقرر کر دیا تھا۔ مختصر یہ کہ سلطنت اودھ کے وجود تک خاندان اجتہاد کا وقار اور احترام برابر برقرار رہا تھا۔

شیعیت میں ہر فرد کے لئے عالم دین کی تقلید فرض قرار دی گئی تھی۔ لکھنؤ میں ابتدائً ایک ہی مجتہد اور عالم دین تھے اور جب اس اکائی میں کثرت ہوئی تو وہ بھی سب کے سب اسی ایک خاندان کے افراد تھے۔ اس طرح شہر کے تمام شیعہ مسلمان ایک ہی زنجیر میں کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہوئے باہم دگر متحد و متفق تھے لیکن رفتہ رفتہ شریعت کدوں میں اضافے ہونے لگے۔ دوسرے مقامات سے علماء آ کر اسی شہر میں آباد ہوئے جن کے معاشرتی رجحانات بہرحال یہاں کی آبادی سے مختلف تھے۔ علماء کے علیٰحدہ علیٰحدہ مرکز قائم ہونے کے نتیجہ میں شیعہ برادری بھی ٹولیوں میں تقسیم ہو گئی۔ لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ باہمی رقابتوں، رنجشوں اور اختلافات کو فروغ ہو گیا۔

فرنگی محل کے علماء بالخصوص مولانا عبدالباری نے اپنی ہوش مندی سے رفتارِ زمانہ کی نبض بالکل ٹھیک دیکھی اور پرکھی تھی۔ اسی لئے انہوں نے سیاسی شعور کی طرف بھی رہنمائی کی تھی لیکن شیعہ علمائے دین نے ابتداء میں انگریزی تعلیم کو حرام قرار دیا۔ سرکاری نوکری کو شرعاً ناجائز ٹھہرایا۔ سیاسیات سے یک لخت کنارہ کشی کا مشورہ دیا۔ بعض اکابرین ملت نے حکومت وقت سے وفاداری اور اس کے احکام پر اطاعت شعاری ہی کو عین ایمان بتایا۔ ان تمام تعلیمات کا فطری طور پر یہ اثر ہوا کہ اس اقلیت در اقلیت جماعت کے افراد مذہب پرستی کے رسمی رجحانات میں مقید ہو کر رہ گئے اور چونکہ مذہبی معاملات میں بھی ان کا شیرازہ منتشر تھا اس لئے سیاسیات کا طوفان بلند ہوا تو ان کو ہر سیاسی پارٹی نے عند الضرورت اپنانے کی کوشش کی۔ ان ہنگامی حالات میں ان کے علماء ان کو کبھی کوئی سیاسی نصب العین نہیں بنا سکے۔ بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں اصلاحات کی ایک کرن نمودار ہوئی تھی اور بعض ارباب بصیرت اپنی جماعت کی رہنمائی پر آمادہ تھے لیکن چوتھی دہائی میں قدیم رجحانات پھر عود کر آئے تھے۔

مذہبیات اور سیاسیات، یہ دونوں موضوع ہمارے لئے خارج از بحث ہیں۔ خاندان اجتہاد نے اپنی پرانی وضعداریاں برقرار رکھی ہیں، شستگی و شائستگی کا ہر مقام پر لحاظ رکھا ہے۔ سیاست سے وہ یقیناً کنارہ کش رہے لیکن خانہ جنگیوں میں انہوں نے اپنی 'شاندار پسپائی' کو جارحیت پر ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ تبلیغ و ترویج عزاداری کی خدمت کا فریضہ ان کو ورثہ میں ملا تھا جس کی ادائی میں وہ کوتاہی نہیں کرتے لیکن اسی کے ساتھ امن و آشتی، پاسداری و رواداری کے بھی وہ علمبردار رہے ہیں۔ اس لئے ان کو یہ کہنے کا حق ہے کہ لکھنؤ کی قدیم پاکیزہ معاشرت میں ان کا خاندان بھی حصہ دار تھا اور اس کی روایت اب بھی وہ ایک حد تک برقرار رکھے ہیں۔ فرنگی محل اور خاندان اجتہاد، یہ دونوں ادارے مسلمان لکھنؤ کے قدیم کلچر کے مذہب معاملات میں پہلے بھی نمائندے تھے اور اب بھی ہیں۔

سلطان المدارس

میڈیکل کالج کے دوسری جانب اور چوراہے سے متصل، قلب شہر میں ایک وسیع مثلث کی آراضی پر ایک عمارت ہے جس صدر راستہ جگت نرائن روڈ پر اور جس کے عقب میں ڈاکٹر پیارے لال روڈ واقع ہے۔ یہ عمارت سلطان المدارس کے نام سے موسوم ہے۔ جو اپنی عظمت پارینہ کی یاد میں اداس اور مضمحل نظر آتی ہے لیکن تقریباً ۶۰/ برس قبل یہاں ایک گلستاں تھا جس کے لہلہاتے سبزے پر نظریں لوٹ جاتی تھیں اور اس سبزہ زار کی حفاظت کے لئے ہر جانب خاردار تاروں کا ایک گھیرا لگا ہوا تھا اور عمارت اپنی نفاست و صفائی کے

اعتبار سے نہایت دیدہ زیب اور بیحد حسین و دلکش تھی۔ عمارت میں صدر مقام پر تعلیم گاہ دو مراتب میں قائم تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے درجات جامعہ سلطانیہ کے نام سے اور مدرسۂ سلطان المدارس موسوم تھا۔ پہلو کی عمارت میں جامعہ کے وائس چانسلر جو بورڈنگ ہاؤس کے نگراں بھی تھے، ذمہ داس گاہ، بورڈنگ ہاؤس اور باورچی خانہ کے جملہ انتظامی امور تھے۔ اصل عمارت سے متصل عقب میں متعدد کمروں میں وہ طالب علم رہتے تھے جو بیرون شہر سے حصول تعلیم کے لئے آتے تھے۔ ان سب کو بلا معاوضہ تعلیم اور قیام و طعام کی سہولتیں فراہم رہتی تھیں۔ غذائیں بھی معقول تھیں اور صفائی و پاکیزگی کا بھی پورا اہتمام رہتا تھا۔

اس تعلیم گاہ کا قیام انتزاع سلطنت اودھ کے بہت بعد عمل میں آیا تھا لیکن اس کی داغ بیل امجد علی شاہ کے زمانے میں پڑ چکی تھی۔ شیعہ عقیدہ کے طالب علموں کو علوم فقہ و حدیث اور تفسیر کے لئے ایک درس و تدریس کے مرکز کی ضرورت لاحق تھی۔ ہوسکتا ہے کہ فرنگی محل سے علیٰحدگی کا جذبہ بھی ابھرا ہو کیونکہ نصیر الدین حیدر کے دور ہی سے شیعیت نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا تھا اور عہد امجد علی شاہ تک، جو بذات خود بہت تقدس مآب تھے، شیعہ مجتہد کا نفوذ دربار میں بہت بڑھ گیا تھا۔ بہرحال ایک ایسی ہی درس گاہ شیعوں کے لئے علیٰحدہ قائم ہوئی اور جامعہ سلطانی کے نام سے موسوم ہوئی۔ امجد علی شاہ کے بعد ان کے جانشین واجد علی شاہ کے زمانے تک جامعہ سلطانی برقرار رہا تھا لیکن اس علیٰحدہ ادارے کے قیام میں تفریق کا کوئی شائبہ نہیں تھا اور نہ کبھی کوئی شیعہ، سنی افتراق کا شائبہ پیدا ہوا کیونکہ امجد علی شاہ کا منشا ہی صرف اس قدر تھا کہ تمام شیعہ انہیں کی طرح پابند شریعت ہو جائیں۔ اس مقصد میں ان کو کس حد تک کامیابی ہوئی تھی، اس کا اتنی مدت کے بعد اندازہ لگانا دشوار ہے۔ بہرحال یہ مدرسہ عہد واجد علی شاہ تک کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتا رہا لیکن ۱۸۵۷ء کی تباہ کاریوں میں اس کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ دینی تعلیم کی ضرورت بہرحال محسوس ہوتی رہی یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر میں بعض عمائدین و علماء شہر بالخصوص ترمنی گنج کے رئیس اعظم آغا ابو صاحب اور جناب مولانا سید محمد باقر مرحوم کی مساعی جمیلہ سے موجودہ ادارہ معرض وجود میں آیا۔ حسین آباد مبارک کے ارباب حل وعقد نے اس کے اخراجات کی کفالت منظور کی۔ ابتدا میں اس کے درجات امامباڑہ آصفی میں لگتے تھے۔ بعد میں موجودہ عمارت کی تعمیر ہوئی اور مدرسہ و کالج یہاں منتقل ہو گئے۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور اپنے حسن نظام کی بدولت اس ادارہ نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی تھی اور سارے ملک میں شہرت کا مالک ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ درس گاہ اپنی فلاح و بقا کے لئے بھی حسین آباد کی مرہون منت تھی اور اب بھی ہے۔

جامعہ سلطانیہ کے پہلے پرنسپل مولانا سید محمد باقر مرحوم تھے اور انہیں کو ہونا بھی چاہئے تھا۔ اس ادارہ کے بانی ہونے کے علاوہ وہ ایک جلیل القدر مجتہد اور ایک جید عالم تھے۔ تقدس و ورع، پاکبازی و پاک طینی اور حسن اخلاق و شرافت نفس میں ان کا مثل و نظیر کوئی نہیں تھا۔ ان کو اس ادارہ سے والہانہ عشق تھا اور انہوں نے اس کو ترقی دینے میں ہر امکانی کوشش کی تھی۔ بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل مدرسین مقرر کئے تھے جن میں مولانا عالم حسین، مولانا عبدالحسن اور مولانا سید محمد رضا مرحوم کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان اساتذہ میں شہرت دور دور تک تھی اور اسی شہرت کی بدولت بالخصوص مولانا سید محمد رضا مرحوم کے ذاتی وقار کے سبب سے ملک بھر میں مدرسہ کو مرجعیت حاصل تھی اور مختلف صوبہ جات سے دینی تعلیم کے خواہشمند طلباء یہاں کھنچ کر آیا کرتے تھے۔ ان اساتذہ نے اپنے طرزِ تعلیم سے طالب علموں میں انتہائی صحت مند ذہنیت تعمیر کرا دی تھی۔ خالص شیعہ دینی تعلیم گاہ ہوتے ہوئے بھی عصبیت و تنگ نظری سے سارا ماحول پاک و صاف تھا۔ مذہبی اختلافی مسائل میں مباحثہ بھی ہوتے تھے، انجیل اور ویدوں پر بھی تبصرے ہو جایا کرتے تھے جن میں اساتذہ اور تلامذہ دونوں حصہ لیتے تھے لیکن مخالف عقیدہ رکھنے والوں کی عدم موجودگی کے باوصف ان کے جذبات کا احترام رکھا جاتا تھا۔ اسی فیض تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس ادارے سے کامیاب ہو کر بعض بڑی بڑی مقتدر ہستیاں نمودار و نامدار ہوئی تھیں۔

راقم کو یاد ش بخیر وہ زمانہ یاد ہے جب وہ اپنے استاد محترم سید محمد رضا مرحوم کے ہمراہ اسی ادارے میں ایک مدت تک مقیم رہا تھا۔ مولانا مرحوم ادب و تہذیب نیز تعلیم و تدریس کے معاملہ میں غیر معمولی طور پر سخت گیر تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے تلامذہ کے لئے پدر شفیق اور ناصح مشفق سے کسی طرح بھی کم نہ تھے۔ بے انتہا خوش گفتار اور خوش مزاج انسان تھے، ان کے پاس بیٹھنے اور بات کرنے میں شیرینی گفتار کا اتنا لطف ملتا تھا کہ وہاں سے پہروں تک ہٹنے کو دل گوارا نہیں کرتا تھا۔ بہت بلند پایہ عالم تھے لیکن عمامہ، عبا اور قبا پہننے سے ہمیشہ گریز کیا۔ لکھنؤ کے شرفاء والی دوپلی ٹوپی، اچکن، ڈھیلا شریفوں والا پائجامہ اور چمڑے کا پمپ جوتا ان کی وضع میں ہمیشہ داخل رہتے تھے۔ شام کو اپنے بعض مخصوص شاگردوں کے ہمراہ لکڑی ہاتھ میں لے کر ہواخوری کے لئے پکے پل تک پیدل جاتے تھے۔ طبیعت میں کوٹ کوٹ کر نفاست بھری تھی۔ صاف و شفاف لباس پہننا اور جیب میں قیمتی گھڑی رکھنا ان کی عادت میں داخل تھا۔ پابندی سے دونوں وقت اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پیتے تھے جس کا بہت ذوق تھا۔ دوسرا شوق گھڑی سازی کا تھا جس میں ان کو بہت کمال حاصل تھا۔ غذا کے سلسلہ میں ذائقہ بہت اچھا رکھتے تھے لیکن کھاتے وہی تھے جو بورڈنگ ہاؤس کے نگراں کی حیثیت سے باورچی خانہ سے ان کے لئے مقرر تھا۔ فرماتے تھے کہ اس عمارت کے اندر وہی کھانا کھانا چاہئے جو سب کھاتے ہیں۔ اپنے لئے علیٰحدہ کوئی

انتظام بھی اصول شریعت کے منافی ہے۔ یہ طرز عمل کسی کفایت شعاری کی بنا پر نہیں تھا۔ ان کے تلامذہ قریب قریب ہر روز کسی مخصوص اچھی غذا کی تواضع ان سے وصول کر لیتے تھے۔ پراٹھے، کباب، اناس کا مزعفر، بالائی کی برف والی قلفیاں وغیرہ وغیرہ۔ قریب قریب ہر روز ہم لوگ منگا منگا کے انہیں کے سامنے کھاتے تھے، وہ بلا تکلف قیمتیں مرحمت فرما دیتے تھے اور ہم لوگوں کو کھاتے اور آپس میں جھگڑتے دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے۔ ان کے حضور ہم لوگوں کو باہم دگر سنجیدہ ظرافت میں مزاح کی بھی اجازت تھی۔ بشرطیکہ حدود میں برقرار رہے۔ فصیح و بلیغ الفاظ میں ان سے باتیں ہوتی تھیں، عربیت بہر حال غالب رہتی تھی۔

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ مولانا سید محمد رضا مرحوم ایک شیعہ عالم دین تھے لیکن ان کا رکھ رکھاؤ غیر شیعہ لوگوں کے ساتھ بھی بہت اچھا تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے اسی مدرسہ کے کمرے میں انتقال فرمایا اور ان کی میت محلہ پاٹا نالہ کی طرف سے غسل خانہ گئی تھی تو قریب قریب ہر دکاندار نے جن میں بہت اکثریت غیر شیعہ تھی، یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ میت مولانا کی تھی، اپنی دکانیں بند کر کے جنازہ میں شرکت کی تھی اور جن لوگوں نے دکانیں نہیں بند کی تھیں، انہوں نے باہر آ کر میت کو کاندھا دیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ہی مدرسہ پر اضمحلال طاری ہو گیا تھا اور اس کا زوال جامعہ کے پرنسپل کی وفات کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا جو اول الذکر سانحہ کے چند ہی برسوں کے بعد واقع ہوئی تھی۔

دو گرانقدر ہستیوں کا یکے بعد دیگرے اٹھ جانا ہی کچھ کم مصیبت نہ تھی۔ اس میں یہ اور اضافہ ہو گیا کہ نئے نظام و انصرام پر قدامت پرستی، تنگ نظری اور رجعت پسندی غالب تھی۔ ان حالات کے خلاف بورڈنگ ہاؤس میں مقیم اعلیٰ درجہ کے طالب علموں نے احتجاج کیا چونکہ معاملہ دینی درسگاہ کا تھا اور استبدادیت حکمراں تھی اس لئے اس اسٹرائک کو جو یوں بھی نئی چیز تھی، عوامی تائید حاصل نہیں ہوئی۔ بعض جدید پسندیت لوگوں نے جن میں راقم بھی شامل تھا، ان 'باغی لڑکوں' کی، جیسا کہ ان کو خطاب مل چکا تھا، حمایت کی جو لا حاصل رہی۔ کمسن لڑکوں کو باقی رکھ کر قریب قریب تمام بالغ و باشعور طالب علم بورڈنگ ہاؤس سے انتہائی بے رحمی کے ساتھ خارج کر دئے گئے لیکن اسی وقت سے درس گاہ کا سارا وقار بھی ختم ہو گیا۔

سلطان المدارس کے علاوہ ایک اور بھی شیعہ دینی درسگاہ ہے جس کے بانی مرزا آغا حسن عرف آغائی صاحب تھے جو عہد شاہی میں نظامت کے عہدہ پر مامور تھے اسی لئے وہ اب تک ناظم صاحب کے لقب سے معروف ہیں۔ انہوں نے من جملہ دیگر امور خیر کے اپنے نام پر ایک 'مدرسۂ ناظمیہ' قائم کیا تھا جس کے درجات ابتداء میں خود انہیں کے امامباڑے میں لگتے تھے۔ اب ایک عالیشان مکان میں یہ مدرسہ منتقل ہو گیا ہے۔ اسی مدرسہ کے منتظم اعلیٰ ایک دوسرے مجتہد مولانا نجم الحسن تھے۔ انہوں نے اس درس گاہ کو ترقی دینے میں بڑی کوشش کی تھی۔ سلطان المدارس کے انحطاط سے اس مدرسہ کو تقویت بھی پہنچی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں تعلیم کا بہتر انتظام ہو لیکن لکھنؤ کی قدیم معاشرت میں جو مقام سلطان المدارس کو حاصل تھا وہ اس ادارہ کو نصیب نہیں ہوا جس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عوام کی توجہ عربی اور دینی تعلیم پر اب بہت کم ہو گئی ہے۔

❑❑❑

'نیا دور' دسمبر ۲۰۱۷ء کے شمارے کی ایک جھلک

اردو زبان کے حروف تہجی پر غضنفر، شافع قدوائی اور نہال الدین عثمانی کے مضامین

ادب کے نوبل انعام سے سرفراز جرمن زبان کی ادیبہ ہیرٹا میوٗلر کے ناول 'پیشی' کا اقتباس

ڈاکٹر نیاز سلطانپوری، دیپک بدکی اور ہریرہ عثمانی کے افسانے

عاتکہ ماہین اور مظہر حسین، افضل خیر آبادی وغیرہ کی نظمیں اور غزلیں

گزشتہ لکھنؤ، مراٹھی ناول ایندھن کی ساتویں قسط اور دیگر تخلیقات

پردہ

یشپال
۱۹۰۳ ۱۹۷۶

چودھری پیر بخش کے دادا چنگی کے محکمہ میں داروغہ تھے۔ آمدنی اچھی تھی۔ ایک چھوٹا لیکن پکا مکان بھی انہوں نے تعمیر کرا لیا تھا۔ بچوں کی تعلیم مکمل کرائی تھی۔ دونوں لڑکے مقابلہ جاتی امتحانوں میں کامیابی حاصل کر کے ریلوے اور ڈاک کے محکمہ میں بابو ہو گئے ۔ چودھری صاحب کی زندگی میں لڑکوں کی شادی اور اسکے بعد اولاد بھی ہوئی لیکن عہدے میں خاص ترقی نہ ہوئی۔ وہی تیس چالیس ہزار روپئے ماہانہ کا درجہ۔

اپنے زمانے کی پرانی یادوں میں محو ہو کر چودھری صاحب کہتے، وہ بھی کیا وقت تھا! لوگ مڈل امتحان پاس کر کے ڈپٹی کلکٹری کرتے تھے اور آج کل کی تعلیم ہے کہ انٹر تک انگریزی پڑھ کر تیس چالیس سے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ بیٹوں کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کا ارمان لئے ہی وہ موت کی آغوش میں سما گئے۔

چودھری صاحب کے کنبے میں برکت ہوئی۔ چودھری فضل قربان ریلوے میں کام کرتے تھے، اللہ نے انہیں چار بیٹے اور تین بیٹیاں دی تھیں۔ چودھری الٰہی بخش ڈاکخانے میں تھے۔ انہیں بھی اللہ نے چار بیٹے اور دو بیٹیاں بخشی تھیں۔

چودھری خاندان اپنے مکان کو حویلی کہتا تھا۔ نام تو بڑا دے دیا لیکن جگہ تنگ ہی رہی۔ داروغہ صاحب کے زمانے میں گھر کا زنانہ حصہ اندر تھا اور باہر بیٹھک میں بیٹھے وہ حقہ گڑگڑایا کرتے۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے ان کے بعد بیٹھک میں زنانے میں شامل ہو گئی اور گھر کی ڈیوڑھی پر پردہ لٹک گیا۔ بیٹھک کے وجود کے ختم ہونے پر بھی گھر کی عزت کا خیال تھا لہٰذا پردہ بوری یا ٹاٹ کا نہیں بلکہ عمدہ اور نفیس قسم کا تھا۔

ظاہر ہے دونوں بھائیوں کے خاندان بظاہر تو ایک ہی گھر میں مقیم تھے لیکن بباطن سب الگ الگ تھا۔ ڈیوڑھی کا پردہ کون بھائی لائے، اس مسئلہ کا حل اس طرح ہوا کہ داروغہ صاحب کے زمانے کی چارپائی کی رنگین دریاں یکے بعد دیگرے ڈیوڑھی پر لٹکنے لگیں۔

> یشپال کا شمار ہندی کے مایہ ناز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ 'جھوٹا سچ' ان کا بیحد مشہور ناول ہے جس کا درجنوں زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ وہ ایک مشہور ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انقلابی شخصیت کے بھی مالک تھے۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے انقلابی سرگرمیوں سے وابستہ تھے لہٰذا طویل عرصہ جیلوں میں گزرا۔ انہیں ۱۹۷۰ء میں پدم بھوشن سے نوازا گیا۔ دیش دروہی، دادا کامریڈ وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں اور پھولوں کا کرتا، سچ بولنے کی بھول، دھرم یدھ وغیرہ کہانی کے مجموعہ بھی ہندی ادب میں خاصی شہرت کے حامل ہیں۔ پیش ہے ان کی مشہور کہانی 'پردہ' جس کا اردو ترجمہ 'محمد حسن' نے کیا ہے۔

تیسری نسل کے شادی بیاہ ہونے لگی۔ آخر چودھری خاندان کی اولاد کو حویلی چھوڑ کر دوسری جگہ تلاش کرنا پڑی۔ چودھری الٰہی بخش کے بڑے صاحبزادے انٹرنس میں کامیابی حاصل کر کے ڈاکخانے میں بیس روپئے کی کلرکی کی نوکری پا گئے۔ دوسرے صاحبزادے مڈل پاس کر کے اسپتال میں کمپاؤنڈر بن گئے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ تعلیم اور نوکری دونوں ہی مشکل سے مشکل تر ہوتی گئیں۔ تیسرے بیٹے ہونہار تھے اس لئے انہیں وظیفہ مل گیا۔ جیسے تیسے مڈل پاس کر کے اسکول میں مدرس ہو گئے اور دیہات چلے گئے۔ چوتھے لڑکے پیر بخش پرائمری سے آگے نہ بڑھ سکے۔ آج کی تعلیم والدین پر اخراجات کے بوجھ کے سوا اور ہے ہی کیا۔ ہر مہینے اسکول کی فیس، کتابیں، کاپیاں اور نقشے وغیرہ کے لئے بس روپئے ہی روپئے۔

چودھری پیر بخش کی بھی شادی ہو گئی۔ مولا کے کرم سے بی بی کی گود بھی جلدی ہی بھری۔ پیر بخش نے روزگار کے طور پر خاندان کی عزت کا پاس رکھتے ہوئے تیل کی مل میں منشی گیری کر لی۔ تعلیم زیادہ نہیں تو کیا، سفید پوش خاندان کی عزت کا پاس و لحاظ تو تھا ہی، مزدوری اور دستکاری ان کے بس کی چیز نہ تھی۔ چوکی پر بیٹھے، قلم دوات کا کام تھا۔

بارہ روپئے ماہوار زیادہ نہیں ہوتا۔ چودھری پیر بخش کو مکان ستوا کی کچی بستی میں لینا پڑا۔ مکان کا کرایہ دو روپئے تھا۔ قرب و جوار میں غریب اور غلیظ لوگوں کی بستی تھی۔ کچی گلی کے درمیان میں گلی کی شروعات میں لگی کمیٹی کے نل سے ٹپکتے پانی کی سیاہ دھار بہتی رہتی، جس کے اطراف میں گھاس بھی اُگ

آئی تھی۔ نالی پر مچھروں اور مکھیوں کے بادل امنڈتے رہتے۔ سامنے رمضانی دھوبی کی بھٹی تھی جس میں سے دھواں کی بلیچنگ زدہ کپڑوں کی بُو چاروں جانب پھیلی رہتی۔ دائیں جانب بیکانیری موچیوں کے گھر تھے۔ بائیں سمت ورکشاپ میں کام کرنے والے قلی رہتے۔

اس ساری بستی میں چودھری پیر بخش ہی تعلیم یافتہ سفید پوش تھے۔ صرف ان کے ہی گھر کی ڈیوڑھی پر پردہ تھا۔ سب لوگ انہیں چودھری جی، منشی جی کہہ کر سلام کرتے۔ ان کے گھر کی عورتوں کو کبھی کسی نے گلی میں گھومتے نہ دیکھا۔ چار پانچ برس کی لڑکیاں بھی کسی کام کی غرض سے باہر نکلتیں اور اس کے بعد گھر کی آبرو کے خیال سے ان کا باہر نکلنا مناسب نہ ہوتا۔ چودھری پیر بخش خود ہی مسکراتے ہوئے صبح شام کمیٹی کے نل سے پانی کے گھڑے بھر لاتے۔

چودھری کی تنخواہ پندرہ برس میں بارہ سے اٹھارہ روپے ہوگئی۔ خدا کی برکت صرف روپے پیسے کی شکل میں نہیں بلکہ آل و اولاد کی شکل میں بھی ہوتی ہے۔ پندرہ برس میں پانچ بچے ہوئے۔ پہلے تین لڑکیاں پھر بعد میں دو لڑکے۔

دوسری لڑکی کی ولادت کے بعد چودھری پیر بخش کی والدہ مدد کے لئے آ گئیں۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسرے کسی بھائی کو والدہ کی فکر نہیں تھی لہٰذا وہ چھوٹے لڑکے کے گھر ہی بس گئیں۔ جہاں بال بچے اور گھر بار ہوتا ہے وہاں سو طرح کی مشکلات بھی ہوتی ہیں۔ کبھی بچوں کو تکلیف تو کبھی بڑوں کو۔ ایسے وقت میں قرض کی ضرورت کیسے نہ پڑے، گھر بار ہو تو قرض بھی ہوگا۔

مل کی نوکری کا اصول پکا ہوتا ہے۔ ہر مہینے کی ساتویں تاریخ کو گن کر تنخواہ مل جاتی ہے۔ پیشگی سے مالک کو چڑھ ہے۔ شدید ضرورت پر ہی مہربانی کرتے۔ وقت ضرورت چودھری گھر کی چھوٹی موٹی چیز گروی رکھ کر قرض لے آتے۔ گروی رکھنے سے روپے کے بارہ آنے ہی ملتے۔ سود ملا کر سولہ آنے ہو جاتے اور پھر چیز کے گھر لوٹنے کی امید ختم ہو جاتی۔

محلے میں چودھری پیر بخش کی عزت تھی۔ عزت کا سبب تھا گھر کی ڈیوڑھی پر لٹکتا ہوا پردہ۔ اندر کچھ بھی ہو، پردہ سلامت رہتا۔ کبھی بچوں کی کھینچ تان اور بے رحم ہواؤں کے سبب پردہ پھٹ جاتا تو سوئی تاگے سے مرمت ہو جاتی۔

دنوں کا کھیل! مکان کی ڈیوڑھی کے در گلتے

گلتے برائے نام رہ گئے۔ متعدد بار کسے جانے سے زنگ آلود کیلیں ٹوٹ گئیں اور سوراخ بھی پھیل گئے۔ مکان مالک سرجو پانڈے کو اس کی قطعی فکر نہ تھی۔

چودھری صاحب کبھی کبھار جا کر کہتے بھی تو جواب ملتا، 'کون بڑی رقم تھما دیتے ہو، دو روپلی کرایہ اور وہ بھی چھ چھ مہینے کا بقایا، جانتے ہو لکڑی کیا بھاؤ ہے۔ نہ بن سکے تو مکان خالی کر دو۔' آخر کار دروازے گر گئے۔ رات میں چودھری انہیں جیسے تیسے چوکھٹ سے ٹکا دیتے۔ رات بھر نیند اچٹتی رہتی اور خطرہ رہتا کہ کہیں کوئی چور نہ آ جائے۔

محلہ میں سفید پوش اور باعزت ہونے کے باوجود چور کے لئے بھی گھر میں کچھ نہ تھا۔ شاید ایک بھی بلا پیوند کپڑے کا ٹکڑا یا برتن چور کے ہاتھ نہ لگتا لیکن چور تو بہرحال چور ہے۔ کھونے کے لئے کچھ نہ ہوئے پھر بھی چور کا خوف تو ہوتا ہی ہے۔ چور جو ٹھہرا۔

چور سے زیادہ فکر تھی، آبرو کی۔ دروازے کی عدم موجودگی میں پردہ ہی آبرو کا رکھوالا تھا۔ وہ بھی ایک رات کی آندھیوں اور بچوں کے کھیل کی وجہ سے تار تار ہوتے ہوتے لٹکنے لائق نہ بچا۔ دوسرے دن گھر کی اکیلی پشتینی چیز دری دروازے پر لٹکی ہوئی تھی۔ محلہ والوں نے دیکھا اور چودھری کو صلاح دی۔

'ارے چودھری! اس زمانے میں دری یوں کیوں خراب کر رہے ہو، بازار سے ٹاٹ کا ٹکڑا لا کر لٹکا دو۔'

پیر بخش ٹاٹ کی قیمت بھی آتے جاتے کئی دفعہ دریافت کر چکے تھے۔ دو گز ٹاٹ آٹھ آنے سے کم میں نہ ملتا۔ ہنس کر بولے:

'ہونے دو، کیا ہے، ہمارے یہاں پکی حویلی میں بھی ڈیوڑھی پر دری کا پردہ رہتا تھا۔'

کپڑے کی مہنگائی کے اس زمانے میں گھر کی پانچ عورتوں کے جسموں سے کپڑے یوں اتر رہے تھے جیسے پیڑ اپنی چھال بدلتے ہیں۔ لیکن چودھری صاحب کی آمدنی سے دن میں ایک دفعہ کسی طرح پیٹ بھرنے کے لئے آٹے کے علاوہ کپڑے کی گنجائش کہاں۔ خود انہیں نوکری پر جانا ہوتا۔ پائجامے میں جب پیوند سنبھالنے کی تاب نہ رہی، تب مارکین کا ایک کرتا پائجامہ ضروری ہو گیا، لیکن مجبور تھے۔ گروی رکھنے کے لئے بھی گھر میں کچھ نہ تھا۔

غریب کا ایک ہی مددگار ہے، پنجابی خان۔ رہنے کی جگہ بھر دیکھ کر وہ روپئے ادھار دے دیتا ہے۔

دس مہینے پہلے جب لڑکے کی ولادت کے وقت پیر بخش کو روپئے کی ضرورت پڑی تو کہیں سے کوئی انتظام نہ ہونے پر پنجابی خان ببر علی خاں ہی سے چار روپئے ادھار لئے تھے۔

ببر علی خاں کا روزگار رستوا کے اس محلہ میں اچھا خاصہ چلتا تھا۔ بیکانیری موچی، ورکشاپ کے مزدور اور کبھی کبھی رمضانی دھوبی سبھی ببر میاں سے قرض لیتے رہتے۔ کئی دفعہ چودھری پیر بخش نے ببر علی کو قرض اور سود کی قسط نہ ملنے پر اپنے ڈنڈے سے مقروض کا دروازہ پیٹتے دیکھا تھا اور انہیں اس معاملہ میں بیچ بچاؤ بھی کرنا پڑا تھا۔

خان کو وہ شیطان سمجھتے تھے لیکن مجبوری کی صورت میں وہی ایک پناہ گاہ بچتی۔ چار آنہ روپیہ مہینے پر چار روپئے قرض لیا۔ شریف خاندانی، مسلمان بھائی کا خیال کر کے ببر علی نے ایک روپیہ ماہوار کی قسط مان لی۔ آٹھ مہینے میں قرض ادا ہونا طے ہوا۔

خان کی قسط ادا نہ کرنے پانے پر اپنے گھر کے دروازے پر فضیحت کا تصور کرتے ہی چودھری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ سات مہینے فاقہ کر کے بھی کسی طرح وہ قسط ادا کرتے رہے لیکن جب ساون میں برسات دیر میں ہوئی اور باجرہ بھی ایک روپئے کا تین سیر ملنے لگا پھر قسط دینا ممکن نہ رہا۔ خان ساتویں تاریخ کی شام ہی کو آ گیا۔

چودھری پیر بخش نے خان کی داڑھی چھو لی اور قسم کھا کر ایک مہینے کی معافی کی درخواست کی۔ اگلے مہینے ایک کا سوا دینے کا وعدہ کیا پھر کسی طرح خان ٹلا۔

بھادو میں حالت اور بھی پریشانی کی ہو گئی۔ بیوی کی طبیعت روز بروز نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔ کھایا پیا پیٹ میں نہ ٹھہرتا تھا۔ گینہوں کی روٹی دینا ضروری ہو گیا تھا۔ گینہوں بہ مشکل ایک روپئے کا صرف ڈھائی سیر ہی ملتا۔

بیمار کا دل ٹھہرا، کبھی پیاز کے ٹکڑے اور دھنیا کی خوشبو کے لئے ہی مچل جاتا۔ کبھی سونف، اجوائن، کالے نمک کی ضرورت ہو تو ندارد۔ چودھری کو دو روپئے مہنگائی بھتے کے ملے لیکن پیشگی لیتے لیتے تنخواہ کے دن صرف چار روپئے ہی حساب میں نکلے۔

بچے گزشتہ ایک ہفتہ سے تقریباً فاقہ کر رہے

مقبولیت کی بلندیوں کو سر کرنے والے عہد جدید کے مشہور شاعر بشیر بدر گزشتہ کافی عرصہ سے بستر علالت پر ہیں۔ ہمیں یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ جلد ہی ہم ان پر بھی ایک گوشہ شائع کریں گے۔ بشیر بدر کی علالت اور ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں ان کی اہلیہ سے گفتگو بھی اس میں شامل ہوگی۔

تھے۔ چودھری کبھی گلی سے دو پیسے کی چولائی خرید لاتے، کبھی باجرہ ابال ابال سب لوگ کٹورا بھر بھر پی لیتے۔ کافی مشکل سے دستیاب ہونے والے چار روپیوں میں سے سوا روپئے خان کے ہاتھ میں دھر دیں، چودھری یہ ہمت نہ کر سکے۔

مل سے گھر لوٹتے وقت ان کا رخ منڈی کی سمت ہو گیا۔ دو گھنٹے کے بعد جب سوچا کہ خان ٹل گیا ہوگا، اناج کی گٹھری لے کر وہ گھر پہنچے۔ خان کے خوف سے دل ڈوب رہا تھا۔ لیکن دوسری طرف چار بھوکے بچے، ان کی ماں، دودھ نہ اترنے کی وجہ سے سوکھ کر کانٹا ہو رہے گود کے بچے اور چلنے پھرنے سے لاچار اپنی ضعیف ماں کی بھوک سے بلابلاتی صورتیں آنکھوں سے سامنے رقص کرتی نظر آتی۔ دھڑکتے ہوئے دل سے اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے آواز نکلتی، 'مولا سب دیکھتا ہے، خیر کرے گا۔'

ساتویں کی شام کو ناکام ہونے کے بعد خان آٹھویں تاریخ کو علی الصبح چودھری کے مل جانے سے قبل ڈنڈا لے کر گھر پر موجود تھا۔ رات بھر سوچ کر چودھری نے خان کے لئے اپنا بیان تیار کیا تھا۔ مل کے مالک لالہ جی چار روز کے لئے باہر گئے ہیں۔ ان کے دستخط کے بغیر کسی کو بھی تنخواہ نہیں مل سکی۔ تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی سوا روپئے حاضر کر دے گا۔

عذر معقول کے باوجود خان بہت دیر تک غراتا رہا:

'ہم وطن چھوڑ کے پردیس میں پڑا ہے، ایسے روپیا چھوڑ دینے کے واسطے ہم یہاں نہیں آیا ہے۔ ہمارا بھی بال بچا ہے۔ چار روز میں روپیا نہیں دے گا تو اب ہم تمہارا۔۔۔۔۔۔۔ کر دے گا۔'

پانچویں دن روپئے کہاں سے آ جاتے۔ تنخواہ ملے ابھی ہفتہ نہیں ہوا۔ مالک نے پیشگی دینے سے انکار کر دیا۔ چھٹے دن قسمت سے اتوار تھا۔ مل میں چھٹی ہونے کے باوجود خان کے ڈر سے چودھری صبح صبح ہی گھر سے نکل گئے۔ جان پہنچان کے کئی آدمیوں کے یہاں گئے۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بیچ کہتے:

'ارے بھائی! ہو تو بیس آنے دے دینا دو ایک روز کے لئے۔ ایسے ہی ضرورت آن پڑی ہے۔'

جواب ملتا:

'میاں! پیسے کہاں، اس زمانے میں۔ کوئی

حیثیت ہی نہیں رہ گئی پیسے کی، ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی قرض چکا دیا گیا۔'

دو پہر ہوگئی۔ خان بھی آیا ہوگا، تو اس وقت تک بیٹھا نہیں ہوگا۔ چودھری نے سوچا اور گھر کی طرف چل دئے۔ گھر پہنچنے پر سنا کہ خان آیا تھا اور گھنٹے بھر تک ڈیوڑھی پر لٹکے ہوئے دری کے پردے کو ڈنڈے سے دھکا دے دے کر مغلظات اگلتا رہا۔

پردے کی آڑ سے بڑی بی بی کے بار بار خدا کی قسم کھا کر یقین دلانے پر کہ چوھری باہر روپئے لانے گئے ہیں، خان غصہ سے کہتا، 'نہیں، بدذات، چور، بھیتر ہی چھپا ہے، ہم چار گھنٹے میں پھر آتا ہے۔ روپیا لے کر ہی جائے گا۔ روپیا نہیں دے گا تو اس کی کھال اتار کر بازار میں بیچ دے گا۔ ہمارا روپیا کیا حرام کا ہے۔'

چار گھنٹے سے پہلے ہی خان کی پکار سنائی دی۔

'چودھری!'

پیر بخش کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی اور ان پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ہاتھ پیر سن اور گلا خشک۔

گالی دے کر پردے کو دھکا دیتے ہوئے دوبارہ پکارنے پر چودھری ایک دم اٹھ کر باہر آ گئے۔ خان آگ ببولہ ہو رہا تھا:

'پیسا نہیں دینے کے واسطے چھپتا ہے۔ خان کے منھ سے نکلا ہوا مغلظات کا طوفان چودھری کے خاندان کے بزرگوں کی عزت تار تار کر گیا۔' ایسے حالات میں چودھری کا جسم اور بھی نڈھال ہوگیا۔ خان کے گھٹنے چھو کر اپنی مصیبت بیان کر کے معافی کے لئے خوشامد کرنے لگے ※

خان کی رفتار بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی بلند آواز سے پڑوس کے موچی اور مزدور چودھری کے دروازے کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ خان غصہ میں ڈنڈا اپھٹکار کر کہہ رہا تھا:

'پیسا نہیں دینا تھا تو لیا کیوں، تنخواہ کدھر میں جاتا؟ مردود! ہمارا پیسا مارے گا؟ ہم تمہارا کھال کھینچ لے گا۔ تم ہم کو بی بی کا گہنا دو، برتن دو، کچھ بھی دو، اب ہم ایسے نہیں جائے گا۔'

بے بسی اور لاچاری میں چودھری کے دونوں ہاتھ خان کے لئے خدا سے دعا مانگنے کے لئے اٹھ گئے اور قسم کھانے لگے ایک پیسا بھی گھر میں نہیں، برتن بھی نہیں، کپڑا بھی نہیں، خان چاہے تو اس کی کھال اتار کر بیشک بازار میں فروخت کر دے۔

خان اور آگ ہوگیا۔

'اب ہم تمہارا دعا کیا کرے گا، تمہارا کھال کیا کرے گا۔ اس کا تو جوتا بھی نہیں بنے گا۔ تمہارا کھال سے تو یہ ٹاٹ اچھا۔'

خان نے ڈیوڑھی پر لٹکی دری کا پردہ جھٹک لیا۔

ڈیوڑھی سے پردہ ہٹتے ہی جیسے چودھری کی زندگی کی رگ جاں کٹ گئی۔ وہ ڈگمگا کر زمین پر گر پڑے۔

اس منظر کو دیکھنے کی تاب چودھری میں تو نہ تھی لیکن دروازے پر کھڑی بھیڑ پوری طرح متوجہ تھی۔

گھر کی لڑکیاں اور عورتیں پردے کی دوسری جانب اس حادثہ کی دہشت سے آنگن کے درمیان کھڑی کانپ رہی تھیں۔ اچانک پردہ ہٹ جانے کی وجہ سے عورتیں ایسے سکڑ گئیں جیسے ان کے جسم کا لباس کھینچ لیا گیا ہو۔ وہ پردہ ہی تو گھر بھر کی عورتوں کے جسم کا لباس تھا۔ ان کے جسم پر بچے ہوئے چیتھڑے ان کے بدن کے ایک تہائی حصہ کو ڈھکنے کے قابل بھی نہ تھے۔

جاہل بھیڑ نے نفرت اور شرم سے آنکھیں پھیر لیں۔ اس برہنگی کی جھلک سے خان کا سخت دل بھی پگھل گیا۔ پردے کو واپس آنگن میں پھینکا اور مایوسی کے عالم میں لاحول پڑھتے ہوئے ناکام لوٹ گیا۔

خوف سے چیخ کر آڑ میں ہونے کے لئے بھاگتی ہوئی عورتوں پر رحم کر بھیڑ تتر بتر ہو گئی۔ چودھری بے سدھ پڑے تھے۔ جب انہیں ہوش آیا تو ڈیوڑھی کا پردہ آنگن میں سامنے پڑا تھا۔ لیکن اسے اٹھا کر دوبارہ لٹکا دینے کی ہمت ان میں باقی نہ تھی۔ شاید اب اس کی ضرورت ہی ختم ہوگئی تھی کیونکہ پردہ جن جذبات کا عکاس تھا وہ جذبات ہی مردہ ہو چکے تھے۔

□□□

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ مع پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی۔ برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **بغیر بینک تفصیلات کے حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔**

ایندھن

حمید دلوائی
۱۹۳۲ ۱۹۷۷

حمید عمر دلوائی مراٹھی زبان کے مقبول ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مراٹھی زبان میں کئی ناول لکھے۔ مراٹھی کے علاوہ ان کی انگریزی میں بھی کچھ کتابوں شائع ہو چکی ہیں۔ مراٹھی اور انگریزی زبان پر انہیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی اور سماجی مسائل پر مبنی ان کی کئی کتابیں مراٹھی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بحیثیت صحافی اپنے کیریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ انڈین سوشلسٹ پارٹی کے نمایاں لیڈر کے طور پر بھی انہوں نے اپنی شناخت قائم کی۔ اپنی محض ۴۴ سالہ زندگی کا کافی بڑا عرصہ انہوں نے مسلم طبقہ بالخصوص مسلم عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں صرف کیا۔

اردو کے ادبی رسالوں میں عام طور پر روسی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی تصنیفات نظر آجاتی ہیں لیکن اردو ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے تراجم شائع کرنے کا رواج ذرا کم ہے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ 'نیا دور' کے ہر شمارے میں ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ ادب پاروں کے ترجمے پیش کئے جائیں۔ اسی سلسلہ کی پانچویں کڑی کے طور پر مراٹھی زبان کے مشہور ادیب حمید دلوائی کے ناول 'ایندھن' کی چھٹی قسط شائع کی جارہی ہے۔

(ایڈیٹر)

'کاشیا تمہیں لینے آیا ہے۔' باپ نے کہا۔ 'تمہارا کیا ارادہ ہے؟'

'مجھے نہیں جانا۔ مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔'

'لیکن کیوں؟' کاشیا نے پوچھا۔ 'تمہیں مجھ سے شکایت ہے؟ کیا ساس تمہیں تنگ کرتی ہے یا دیورانی ستاتی ہے؟ بات کیا ہے؟ بتاؤ۔'

'کوئی وجہ نہیں، کچھ نہیں۔ مجھے تمہارے ساتھ بسنا ہی نہیں ہے۔'

'کیا؟ ایسا کہتی ہو؟'

کاشیا بھڑ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ اس پر جھپٹ کر گلا گھونٹ دے لیکن یہ خیال اس کے ذہن کے اندر ہی گھل گیا، وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے منانے لگا۔ وہ اسے الٹے سیدھے جواب دیتی رہی اور اس کا باپ بے بسی سے کھڑا ان کی تکرار سنتا رہا۔

لیکن اسی لمحے لکشمی کے شوہر کی نظر اسحق پر پڑی۔ اسحق جان بوجھ کر وہاں سے دور کھڑا تھا۔ اس کے کان اس بات چیت پر لگے ہوئے تھے۔ وہ ان کا کہا ہوا ایک ایک لفظ جذب کر رہا تھا اور یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔

لکشمی کا شوہر اس کے پاس گیا، لکشمی کا باپ بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ لکشمی خود وہیں کھڑی رہی۔ کاشیا نے جھگڑے کی پوری تفصیل اسحق کو بتائی اور پھر دہرایا کہ وہ لکشمی کو اپنے ساتھ لے جانے آیا ہے۔

اسحق کو یہ سب کچھ پہلے سے معلوم تھا۔ 'تو لے جاؤ' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

لکشمی کے شوہر کو یہ سن کر بہت سکون ملا۔ یہ دیکھ کر کہ مالک کو کوئی اعتراض نہیں، اسے اپنا کام آسان ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ لکشمی کا باپ بھی خوش ہو گیا۔ وہ بھی یہ چاہتا تھا کہ اس کی لڑکی شوہر کے ساتھ چلی جائے۔ مہارواڑے میں اس کی بلاوجہ بے عزتی ہو رہی تھی۔

اسحق کی بات سے لکشمی کے شوہر کو اور حوصلہ ملا۔ اس نے سوچا، مالک کو بیچ میں ڈال کر لکشمی کو واپس لوٹنے پر مجبور کرے۔ اس نے اسحق نے کہا۔ 'لیکن وہ آسانی سے نہیں جائے گی، زمیندار صاحب! آپ ہی اسے سمجھائیے۔'

'میں؟ میں بھلا کیوں تمہارے گھریلو معاملات میں پڑوں؟' اسحق نے پوچھا۔ 'اسے تم لوگ آپس میں ہی سلجھاؤ۔'

بات کچھ غلط نہ تھی۔ اب لکشمی کے شوہر کو امید ہو چلی کہ اسے ساتھ لے جانا ممکن ہوگا لیکن اس کے باوجود کھونٹا ہلا کر اس کی مضبوطی جانچنے کے ارادے سے اس نے کہا، 'اس کو ساتھ لے جانے پر آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا؟'

'مجھے؟ مجھے کوئی اعتراض نہیں! مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا؟'

'لیکن اس کے کام کے سلسلہ میں، روپئے پیسے کے حساب کے سلسلے میں۔۔۔۔'

'ہاں'، اسحق بولا۔ 'اس پر میری کچھ رقم نکلتی ہے۔ وہ تو چکانی ہی ہوگی۔ اس کے بعد ہی اسے جانے

دے سکتا ہوں۔'

'ہاں ہاں، میں وہی تو پوچھ رہا ہوں۔'

'میں بھی وہی بتا رہا ہوں۔'

'کتنے پیسے نکلتے ہیں؟'

'سو، سو روپئے'

لکشمی کا شوہر یہ رقم سن کر چونک پڑا۔ اسے اندر ہی اندر مایوسی ہونے لگی۔ سو روپئے چکانے کا مطلب تھا کہ کم سے کم سال بھر اور رکنا پڑے گا۔ تب تک لکشمی کے ہاتھ لگنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن اسے کہیں سے اتنے پیسے اکٹھا کر کے مالک کو ادا کرنے کا خیال آیا۔ اس نے پوچھا، اگر اتنے پیسے میں ادا کر دوں تو آپ اسے جانے دیں گے؟

بالکل!، اسحق نے جواب دیا۔ 'میری رقم واپس مل جائے تو اس کے جانے پر مجھے کیا اعتراض ہوگا!'

لکشمی کا شوہر سوچ میں پڑ گیا۔ اسے کہیں نہ کہیں سے سو روپئے کا انتظام کر کے مالک کو ادا کر کے یہ رکاوٹ دور کرنی تھی۔ پھر لکشمی ہوگی اور وہ خود اور پھر لکشمی کمزور پڑ جائے گی۔ تب اسے ساتھ لے جانا اور اس کی اوقات یاد دلانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ وہ بولا، 'میں پندرہ بیس دن میں آپ کے پیسے چکا دوں گا، ٹھیک ہے نا؟'

'بیشک! پیسے چکا دو اور خوشی سے اسے لے جاؤ۔'

لکشمی دور کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی۔ اس کا باپ اور شوہر آپس میں بات کرتے ہوئے دھیرے دھیرے مہارواڑے کی طرف چلے گئے۔ وہ ان کی اوجھل ہوتی ہوئی پرچھائیوں کو کچھ دیر غور سے دیکھتی رہی۔ ان ساری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر پیسے چکا بھی دئے گئے تو وہ شوہر کے ساتھ نہیں جائے گی۔

پندرہ دن اسی طرح بیت گئے۔ اس دوران اسحاق کے مکان کی دیواریں آہستہ آہستہ خاصی اونچی ہو گئیں۔ موٹے موٹے شہتیر اور لمبے لمبے سریے لٹکنے لگے اور ان کے ٹیڑھے میڑھے سائے بغیر چھت کے مکان کے فرش پر پڑنے لگے۔ دھوپ میں سائے لمبے ہونے لگے اور لکشمی دیوار سے بندھے ہوئے اونچے لکڑی کے تختے پر کھڑی ہو کر نیچے سے اچھالے ہوئے پتھر تھامنے کا کام کرتی دکھائی دینے لگی۔

لیکن مہینے بھر میں لکشمی کا شوہر سو روپئے لے کر آموجود ہوا۔ اسحق نے اوپری مسکراہٹ کے ساتھ پیسے وصول کئے اور لکشمی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب کیا کیا جائے؟ اگر اس کا شوہر اسے زبردستی ساتھ لے گیا تو کیا ہوگا؟ لیکن پھر اسے یاد آیا کہ لکشمی نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ وہ جان دے دیگی مگر شوہر کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اس نے اس کے شوہر سے کہا، ٹھیک ہے، شام تک میں اسے آزاد کر دیتا ہوں۔

لکشمی کا شوہر وہاں سے فوراً اس کے باپ کے پاس چلا گیا اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے باپ گھر آیا۔ پھر شام کے دھندلکے کے وقت لکشمی نمودار ہوئی۔ اندر آتے ہی اس نے ان دونوں کو دیکھا تو اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ اندھیرا اور گہرا ہونے لگا تھا۔ کوئی کسی کو دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ نہ کسی کو بتی جلانے کا خیال آیا۔ شوہر نے ایک بار اس سے پوچھا، پر لکشمی نے اسے حتمی جواب دے دیا، نہیں چلوں گی۔ کچھ بھی ہو، مجھے تمہارے ساتھ نہیں بسنا ہے۔ اس اندھیرے پر شوہر کے چہرے پر ہونے والا ردِّعمل نظر نہ آیا۔ لیکن اگر آ بھی جاتا تو اسے اس کی کوئی پروانہ تھی۔

شام کی سیر کے دوران سڑک سے دیکھنے پر مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ دیوار کے بجائے اسحاق سے ٹیک لگائے کھڑی ہے۔

پندرہ دن۔۔۔۔ بیس دن۔۔۔ پچیس دن۔۔۔ لکشمی کا شوہر نہیں آیا۔ اسحق نے سکون کا سانس لیا۔ اس بودھ کو بھال سو روپئے کہاں سے ہاتھ آنے لگے! لیکن اگر وہ کہیں سے لے آیا تو پھر کیا ہوگا؟ میرا تو اس پر ایک پیسہ بھی نہیں نکلتا یا پھر ان سو روپیوں کی اس کے لئے ساڑیاں خرید کر حساب پورا کر دیا جائے؟ کیا کیا جائے؟ لیکن فی الحال تو لکشمی کے شوہر کے نہ آنے سے اس کی فکر مٹ گئی تھی۔

لیکن مہینے بھر میں لکشمی کا شوہر سو روپئے لے کر آموجود ہوا۔ اسحق نے اوپری مسکراہٹ کے ساتھ پیسے وصول کئے اور لکشمی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب کیا کیا جائے؟ اگر اس کا شوہر اسے زبردستی ساتھ لے گیا تو کیا ہوگا؟ لیکن پھر اسے یاد آیا کہ لکشمی نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ وہ جان دے دیگی مگر شوہر کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اس نے اس کے شوہر سے کہا، ٹھیک ہے، شام تک میں اسے آزاد کر دیتا ہوں۔

لکشمی کا شوہر وہاں سے فوراً اس کے باپ کے پاس چلا گیا اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے باپ گھر آیا۔ پھر شام کے دھندلکے کے وقت لکشمی نمودار ہوئی۔ اندر آتے ہی اس نے ان دونوں کو دیکھا تو اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ اندھیرا اور گہرا ہونے لگا تھا۔ کوئی کسی کو دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ نہ کسی کو بتی جلانے کا خیال آیا۔ شوہر نے ایک بار اس سے پوچھا، پر لکشمی نے اسے حتمی جواب دے دیا، نہیں چلوں گی۔ کچھ بھی ہو، مجھے تمہارے ساتھ نہیں بسنا ہے۔ اس اندھیرے پر شوہر کے چہرے پر ہونے والا ردِّعمل نظر نہ آیا۔ لیکن اگر آ بھی جاتا تو اسے اس کی کوئی پروانہ تھی۔

لکشمی کا باپ گنگ بیٹھا تھا۔ شوہر اسے گالیاں دینے لگا۔ اس نے باپ پر اس کو بھڑکانے کا الزام لگایا۔ کہنے لگا، 'تم کیوں اس کا ساتھ دے رہے ہو؟ اسے اپنے گھر میں کیوں رکھ رکھا ہے؟ نکال کیوں نہیں دیتے؟ کیوں میرے گھر کو برباد کر رہے ہو؟'

لکشمی کا باپ اس الزام پر پھٹ پڑا، 'اگر تم یہی سمجھتے ہو تو لے جاؤ اسے اپنے ساتھ، گھسیٹ کر لے جاؤ، زبردستی لے جاؤ۔'

'تم بیچ میں تو نہیں آؤ گے؟'

'نہیں'

'دیکھو، ایک بار پھر سوچ لو'

'نہیں، نہیں'

لکشمی کے شوہر کو یہی چاہئے تھا۔ وہ اٹھا اور اس کی کمر میں لات ماری، وہ لڑکھڑا کر زمین پر رکھے مٹی کے برتنوں سے جا ٹکرائی اور جب اٹھنے لگی تو دوسری لات اس کی کمر میں لگی۔ وہ برتنوں پر گر پڑی اور سارے برتن چکنا چور ہو گئے۔ شوہر نے اس کا بازو پکڑ کر اسے دھیرے سے اٹھایا اور جھونپڑی سے باہر ڈھکیل دیا۔ باہر پہنچ کر وہ اسے زور سے کھینچنے لگا۔ لکشمی اس کے پیچھے پیچھے زمین پر گھسٹنے لگی۔

اگلے روز جب میں سیر کو نکلا تو اسحق نے مجھے اپنے مکان پر بلا کر یہ سب قصہ سنایا۔ اسے لکشمی کے شوہر کی دلیری پر تعجب ہو رہا تھا اور مایوسی ہو رہی تھی کہ لکشمی سے اس کو جو توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شوہر کی مار پیٹ کے سامنے وہ اتنی بے دم کیسے ہو گئی۔ وہ پاگل سا ہو گیا تھا۔ مکان کی تعمیر کے کام سے اس کا دھیان بالکل ہٹ چکا تھا۔

لیکن پھر دھوپ میں اور زیادہ حدت آ گئی اور شام کے وقت بھی تپش قائم رہنے لگی۔ ہوا بالکل بے قابو ہو گئی۔ گرم جھکڑ چلنے لگے اور دھول کے بادل کے بادل اڑنے لگے۔ کبھی کبھی سڑک پر چلتے ہوئے کچھ نہ دکھائی دیتا۔ گھر پر پڑے پڑے چھت کی کڑیوں پر نظر جمانے سے سخت ناقابل برداشت تپش محسوس ہونے لگی۔ میں آنگن میں بیٹھا پورب کی طرف سرکتے ہوئے دھول کے بادلوں کو دیکھتا رہتا۔

بھائی کی زمین پر بوائی کی تیاری شروع ہو گئی اور وہ کام میں بہت مصروف ہو گیا۔ وہ گھر پر کم ہی بیٹھتا، لیکن تب بھی زیادہ بولتا چالتا نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ جب سے میں سمتی سے اس کے گھر پر مل کر آیا ہوں، تب سے وہ مجھ سے کم سے کم بات کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا اس وجہ سے کہ سمتی اس سے کترانے لگی تھی؟ کیا اس لئے کہ وہ اس شیطانی چکر سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی جس میں وہ پھنسی ہوئی تھی؟

لیکن سمتی تو مجھ سے مل ہی نہیں رہی تھی۔ اس رات کے بعد وہ مجھ سے نہیں ملی تھی۔ ان تمام دنوں اپنی شام کی سیر کے وقت بھی میرا اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ کیا اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا؟ بازار بھی

نہیں جاتی؟ یا وہ مجھ سے کترا رہی تھی؟ یا بھائی نے اسے دھمکایا تھا؟

بھابی نے بھی سمتی کے بارے میں بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس دن کے طنزیہ فقروں کے بعد سے اس نے سمتی کا موضوع چھیڑا ہی نہیں تھا۔ اور میرا بھی اس کے بارے میں بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

سمتی کے موضوع کو چھوڑ کر بھابی مجھ سے پہلے ہی کی طرح برتاؤ کرتی تھی۔ کئی بار وہ اپنا کام نمٹا کر میرے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتی۔

لیکن بابا کے برتاؤ میں اور زیادہ کھلا پن آ گیا تھا۔ وہ اور زیادہ دل کھول کر باتیں کرنے لگے۔ اسحق والے واقعہ کے بعد ان کے برتاؤ میں کچھ دن کے لئے جو کٹھور پن آ گیا تھا، وہ اب پگھل چکا تھا۔ کیا ان کے کھلے پن کا سبب یہ تھا کہ وہ جانتے تھے کہ میں جلد ہی بمبئی جانے والا ہوں، یا وہ میرے ساتھ اپنے آخری دن اچھی طرح گزارنا چاہتے تھے، یہ میں اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔

اور ایک دن لکشمی اپنے شوہر کو چھوڑ کر لوٹ آئی۔ وہ کب واپس لوٹی یہ مجھے معلوم نہ ہوا، لیکن ایک شام جب میں اسحق کے مکان کے سامنے سے گزرا تو وہ مجھے وہاں کام کرتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ پہلے جیسے بے پروا انداز میں دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ دیواریں اب اور اونچی ہو گئی تھی، اور وہ بھی اب اتنی ہی اونچائی پر کھڑی اچھالے ہوئے پتھر سنبھال رہی تھی۔

اسے دیکھ کر میرے قدم سست پڑ گئے اور اوپر سے اسحق کی آواز میرے کان میں آئی۔

'اے، بہت دن بعد آئے! اوپر آ جاؤ نا!'

میں بے اختیار اس کے پاس چلا گیا اور بولا،

'تمہارا مکان دیکھنے آیا ہوں۔ مگر لکشمی کب واپس آئی؟'

'آ گئی!' اسحق نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ 'واہ وا! کیا کہنا! تم تو چھپے رستم نکلے، لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا کسی چیز سے کچھ لینا دینا نہیں اور تم لکشمی کی پوچھ تاچھ کرنے لگے ہو۔ ہاں، دلچسپی ہے؟'

'نہیں رے بابا! میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔'

'تو پھر سنو! کیا تم جانتے ہو کہ لکشمی کے شوہر نے اسے داغ دیا ہے؟'

'کہاں؟'

'کہاں؟ ہا ہا! ارے کہاں کیا پوچھتے ہو! تمہیں

کیسے دکھائی دے گا؟'

مجھے اپنا سوال احمقانہ محسوس ہونے لگا۔ میں نے یونہی پوچھنے کی خاطر پوچھا، 'لیکن وہ آ کیسے گئی؟'

'بھاگ آئی'

'اور تم نے اسے پھر کام پر رکھ لیا؟'

'کیوں، تو کیا غلط کیا؟ میں نے تو اسے رہنے کی جگہ بھی دے دی ہے۔'

'رہنے کی جگہ؟'

'ہاں، ہاں۔ وہ اب اپنے باپ کے گھر نہیں رہتی۔ اس کے باپ کا کہنا ہے کہ وہ اپنے داماد کا الزام نہیں لینا چاہتا۔'

'اور تم پر جو الزام آئے گا وہ؟'

'مجھ پر؟ ہاہاہا، مجھ پر الزام لگانے والا ابھی پیدا نہیں ہوا۔'

'میں گردن اٹھا کر دیکھنے لگا۔ لکشمی اب اور زیادہ اونچائی پر کھڑی تھی۔ اس کی ساڑی کے کاسوٹا (مہاراشٹر کی نوگزی ساڑی کا پلو جسے ٹانگوں کے درمیان سے پیچھے لے جا کر کمر میں کھونس لیا جاتا ہے تاکہ کام کاج کرنے میں سہولت ہو) مارے ہوئے پلو سے اس کی گوری پنڈلیاں جھانک رہی تھیں۔'

'ارے نہیں صاحب! وہاں نہیں، داغ تو کہیں اندر ہے، بہت اندر'

لیکن میں داغ کو نہیں دیکھ رہا تھا۔

اسحق کے اس قدم نے گاؤں میں طوفان کھڑا کر دیا۔ مہارواڑے میں پہلے بے چینی کے آثار ظاہر ہوئے۔ بودھوں نے ایک سبھا بلائی اور لکھیا پر زور دیا کہ وہ لکشمی کو اس کے شوہر کے پاس واپس بھیجے۔ اسے دھمکی دی گئی کہ ایسا نہ ہوا تو اسے جات باہر کر دیا جائے گا۔ لکھیا ایک دو بار اسحق سے ملا لیکن اس نے ہر بار پہلے کی طرح ٹکا سا جواب دے کر ٹال دیا۔ آخرکار کلواڑی بھی اس معاملے میں شریک ہو گئے اور بودھوں کا ساتھ دینے لگے۔ قصبے کا ماحول تناؤ بھرا ہو گیا۔

میں اسحق سے ملا اور اس سے کہا، 'اس لکشمی کو کام سے نکال دو۔ بلا وجہ کی چخ چخ مت کرو۔ کم سے کم اسے اپنے مکان میں تو مت رکھو۔'

لیکن اس نے میری بات نہ ماننے کی ٹھان رکھی تھی۔ ضد پر اڑا رہا۔ 'ہمارے پاس پیسہ ہے، ہماری دھاک ہے۔ ایک ہانک لگانے پر بہت آدمی دوڑے آئیں گے اور پھر ہم لوگ زمیندار ہیں۔ ہماری زمینداری قانونی طور پر ختم ہو گئی تو کیا، لوگ تو ہمیں اب بھی زمیندار ہی کہہ کر پکارتے ہیں نا۔'

وہ اس طرح کی دلیلیں دیتا رہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

سارے گاؤں میں اسحق کے لکشمی کو پناہ دینے کے معاملے میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ لوگوں کے بات کرنے کے لئے بس یہی ایک موضوع رہ گیا۔ مسلمانوں کو اسحق کی حرکت ناگوار گزری تھی۔ وہ کہنے لگے، ارے ماس کھا کر ہڈی پھینک دینی چاہئے۔ اسے گلے میں پہن کر ناچتے پھرنا کیا ضروری ہے! کوئی مسلمان عورت ڈھونڈھ کر اس سے شادی کر لو۔ اس مہارن کو گھر میں ڈالنے کی کیا ضرورت؟ لیکن اوپری طور پر انہوں نے یہ سب معلوم نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے یوں ظاہر کیا جیسے اس معاملے کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتے ہوں۔ اپنی باتوں اور برتاؤ سے وہ یوں دکھائی دینے لگے جیسے یہ کوئی خاص بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہی آیا ہے اور آگے بھی ہوتا رہے گا۔ آخر سمتی بھی تو دوسرے اسحق کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور گاؤں میں اس کے علاوہ کیا کم قصے چل رہے ہیں؟ بس فرق یہ ہے کہ اسحق نے یہ ہڈی گلے میں پہن رکھی ہے۔

لیکن یہ دلیل مہاواڑے کے لوگوں کو ہضم نہیں ہوئی۔ انہیں لگا کہ ان کی ناک کٹ گئی ہے۔ انہیں یہ تو عادت تھی کہ ان کی عورتیں مسلمان زمینداروں سے تعلقات رکھتی تھیں، لیکن کوئی مہارن یوں گھر چھوڑ کر کسی زمیندار کے گھر میں نہیں پڑی تھی اور پھر کلواڑی مہاروں کی کھلے عام ہتک کرنے لگے تھے۔ وہ راستے میں جہاں کہیں کسی مہار کو دیکھتے، اسے طعنہ دیتے کہ لکشمی زمیندار کے گھر جا بیٹھی ہے۔

اسی دوران کسی کو لکشمی کی گوری رنگت کا سبب ڈھونڈھنے کی سوجھی۔ کلواڑی کہنے لگے، 'یہ اتنی گوری کیسے ہے؟ اتنی سندر کس طرح ہے کہ بودھوں میں الگ دکھائی دیتی ہے؟ کیا تمہیں پتہ نہیں؟ اس کی ماں لکھیا کے ساتھ کبھی بسی ہی نہیں۔ سلیمان زمیندار کے گھر پڑی ہوئی تھی۔ یہ اسی کی بیٹی ہے! تو پھر کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے!'

یہ بات رفتہ رفتہ پھیلنے لگیں۔ ہر جگہ یہی ذکر ہونے لگا اور آخر لکھیا کے کانوں تک بھی پہنچا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر وہ ایک دن بابا کے پاس آیا۔ بابا نے ان کی بات خاموشی سے سنی اور پھر ان سے پوچھا، اس میں میں کیا کر سکتا ہوں۔

'آپ اسحق زمیندار سے کہہ کر لکشمی کو اس کے گھر سے باہر نکلوائیے۔'

بابا کچھ دیر خاموش رہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا، 'کیوں رے، کیا کریں؟'

'ہم کیا کر سکتے ہیں؟'

'کیوں، تمہارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے؟'

ان کے سوال پر مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ میں سب مسئلوں کے حل لے کر گاؤں تھوڑا ہی آیا تھا۔ لیکن میں نے غصے پر قابو پر کر جواب دیا، 'میں نے ایک بار اسحق سے بات کی تھی لیکن وہ مانتا ہی نہیں۔'

مجھ سے بات ختم کر کے وہ لکھیا سے بولے، 'ایسا پہلے نہیں ہوتا تھا کیا؟ آج تمہیں اس پر اتنا برا کیوں لگ رہا ہے؟'

'لیکن زمیندار صاحب، اس طرح کوئی عورت

کسی کے گھر تو نہیں رہ پڑی تھی' لکھیا نے بڑے ادب سے کہا۔'اس میں آپ لوگوں کی عزت بھی جاتی ہے اور ہماری بھی۔'

'یہ سچ ہے۔'بابا نے کہا،'لیکن مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ اس پر دھیان ہی مت دو۔ یہ اسحق تو بیوقوف ہے۔آج اسے اپنے گھر میں ڈال لای ہے،کل اپنے آپ چھوڑ دے گا۔ یوں بھی آدمی ایک عورت سے کبھی نہ کبھی اکتا ہی جاتا ہے۔'

انہوں نے بابا کی باپ چپ چاپ سن لی۔ پھر ان میں سے ایک نے پوچھا،'تو پھر ہم کیا کریں؟

'کچھ مت کرو،اپنے آپ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'

تب ان میں سے ایک نوجوان اٹھ کھڑا ہوا اور بولا،'ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ ہماری عزت کا سوال ہے۔آپ اس سلسلہ میں کچھ تو کیجئے۔'

'لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔'

'اسحق کو کچھ عقل دیجئے۔ میں پوچھتا ہوں زمیندار صاحب،اگر آپ لوگوں کی لڑکی اس طرح ہم بودھوں کے پاس آجاتی تو آپ کیا کرتے؟'

بابا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ان کے بدن میں ایسی تھرتھری پیدا ہوئی جیسی طوفانی ہوا میں کوئی بڑا درخت لرزتا ہے۔ پھر بولے،'مسلمانوں کی لڑکی کسی بودھ کے پاس جاتی ہی نہیں۔'

'اب یہ بھول جائیے،زمیندار صاحب۔'اس نے گرج کر کہا۔چوری چھپے چلنے والے کتنے قصے آپ کو بتاؤں؟ اب ہم بھی یہی کریں گے؟ آپ لوگوں کی لڑکیاں اپنے گھروں میں لاکر رکھیں گے۔'

بابا نے بے بسی سے گردن ہلائی۔اس نوجوان نے ان کے دل پر گھاؤ لگایا تھا۔کیا ان کو یہ قصے معلوم نہیں تھے؟ لیکن انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی ان باتوں کا کھلم کھلا ذکر بھی ہوگا۔انہوں نے پھر کہا۔

'ارے بھائی، جو کرے گا،سو بھرے گا۔لیکن اگر میری لڑکی جاتی تو میں اسے گھسیٹ کر واپس لاتا۔ میں کسی کی کوئی پروانہ کرتا۔'

'تو پھر اگر ہم اسے گھسیٹ لائیں تو؟ ہمیں اس پر مجبور نہ کیجئے صاحب،آپ ہی سمجھداری سے معاملہ طے کرائیے۔'

بابا نے ان لوگوں کو وہیں بٹھا کر اسحق کو بلوایا اور اسے مختصراً ساری بات بتائی۔سب کچھ سننے کے بعد اسحق نے پوچھا،'تو آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'

'لکشمی کو واپس بھیج دو، کیوں جھک جھک کر رہے ہو؟'

'لیکن وہ جانے پر راضی نہیں ہے۔'

'ٹھیک ہے۔ اسے ہم دیکھ لیں گے۔ آپ اسے اپنے گھر میں مت رکھئے۔'لکھیا نے اس سے التجا کی۔

'کیوں بھئی؟ کیا میں نے اسے زبردستی اپنے گھر میں رکھا ہے؟ میں اسے باہر کیوں نکالوں؟'

'نہیں نکالیں گے تو ہم اسے زبردستی لے جائیں گے۔'بودھوں نے ایک آواز میں کہا۔ پھر وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔اسحق کو بابا کی یہ سمجھوتا کرانے کی کوشش اچھی نہیں لگی۔وہ بھی غصے میں اور کچھ کہے بغیر اٹھ گیا۔

اگلے دن لکشمی نے اسحق کے زیر تعمیر مکان پر کام کرنے آنا بند کر دیا۔بودھوں کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لکشمی کا ٹھور ٹھکانا انہیں معلوم نہ تھا۔انہیں لگتا تھا کہ اسحق نے اسے اپنے ہی گھر میں رکھا ہوگا لیکن جب اسحق سے اس بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔کندھے اچکاتے ہوئے بولا،'مجھے کیا پتہ کہ وہ کہاں گئی؟' لیکن کلواڑیوں نے چکرائے ہوئے بودھوں کو اور چڑایا۔ان دونوں برادریوں کی سبھا بیٹھی اور اسحق کے کام پر سب مزدوروں نے آنا بند کر دیا۔

وہ تین دن اسحق کے زیر تعمیر مکان پر سناٹا چھایا رہا۔اسحق وہاں سر پکڑے بیٹھا رہتا۔مزدور نہیں تھے، اس لئے راج معمار صرف حاضری لگا کر چلے جاتے۔ بڑھئی ہتھیلیوں میں چونا ملتے فارغ بیٹھے دکھائی دیتے مگر چوتھے دن اسحق نے گاؤں کے باہر سے مزدور بلوا لئے۔ان کو بڑھا کر روزنداری (یومیہ اجرت) دی۔ مکان کی تعمیر کا کام ایک بار زور وشور سے شروع ہو گیا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے بڑھئی پھر رندا چلاتے نظر آنے

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں ، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

لگے۔ راج معمار جلدی جلدی پلستر کرنے لگے۔ اسحٰق کے مکان کی جگہ پر پھر سے چہل پہل ہوگئی۔ اسحٰق کہنے لگا، گاؤں کے مزدوروں سے باہر کے مزدور زیادہ اچھے ہیں۔ شرافت سے کام کرتے ہیں، اور نہ کریں تو ان سے پیٹھ پر لات مار کر کام کرایا جاسکتا ہے۔

اور زیادہ مزدور لگا کر اس نے مکان کا کام جلدی پورا کرالیا۔ دیواریں پوری کھڑی ہوگئیں۔ ان پر چھت پڑ گئی۔ چھت پر کھپریلیں لگ گئیں۔ بس پلستر اور فرش بندی کا کام باقی رہ گیا۔ اس نے سوچا، برسات کا پانی تو نکل گیا، گھر بھرنی (نئے مکان کی تعمیر مکمل ہونے پر منائی جانے والی تقریب) کرانے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں۔ باقی کام بھی دھیرے دھیرے ہوتا رہے گا۔ مہورت دیکھ کر اس نے گھر بھرنی کی تیاری شروع کردی۔

اس دن اس نے قصبے کی کل مسلمان برادری کو دعوت دی۔ رات کے وقت سب لوگ جمع ہوگئے۔ میں بھی گیا۔ گیارہویں کی نیاز ہوئی۔ میں آنگن میں بیٹھا رہا۔ اسحٰق اس رات بیحد خوش تھا۔ میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر وہ میری بغل میں آ بیٹھا اور مجھ سے بولا، 'تم گیارہویں پڑھنے نہیں گئے؟ ٹھیک ہی ہے۔ تم تو نماز روزے تک سے فارغ ہو۔'

'ہاں، مگر میرے گیارہویں کی نیاز کھانے پر تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا نا؟ کیا نیاز بنوائی ہے؟'

'میٹھا کھانا، میٹھا کھانا بنوایا ہ۔ جتنا چاہو کھاؤ۔ ڈبل مانگ کے لینا۔ برتن بھر کے گھر کے لئے بھی لے کر جانا۔ بابا کو مت بھولنا۔ میں آج خوش ہوں۔ مگر ایک بات بتاؤ۔ تم گیارہویں کیوں نہیں پڑھتے؟ دین کو، اسلام کو تم کیوں نہیں مانتے؟'

'تم جیسے لوگوں سے ملنے کے بعد میرا کسی چیز پر ایمان نہیں رہا۔'

'کیا مطلب؟'

'اس کا مطلب تم جانتے ہو۔ اس بودھ عورت کو اپنے گھر میں کیوں چھپا رکھا ہے؟ تمہارے دین کو میں کیسے مانوں؟'

'ارے واہ! لیکن اگر اس سے سمبندھ نہ رکھوں تو پھر کیا کروں؟ قصبے کی کوئی مسلمان عورت میرے پاس نہیں آتی۔'

میں حیران رہ گیا۔

'ارے گاؤں کی لڑکیاں اب بڑی ہوشیار ہوگئی ہیں۔ وہ کیپ ٹاؤن والا کہہ کر میرا مذاق اڑاتی ہیں۔

اور زیادہ مزدور لگا کر اس نے مکان کا کام جلدی پورا کرالیا۔ دیواریں پوری کھڑی ہوگئیں۔ ان پر چھت پڑ گئی۔ چھت پر کھپریلیں لگ گئیں۔ بس پلستر اور فرش بندی کا کام باقی رہ گیا۔ اس نے سوچا، برسات کا پانی تو نکل گیا، گھر بھرنی (نئے مکان کی تعمیر مکمل ہونے پر منائی جانے والی تقریب) کرانے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں۔ باقی کام بھی دھیرے دھیرے ہوتا رہے گا۔ مہورت دیکھ کر اس نے گھر بھرنی کی تیاری شروع کردی۔

اس دن اس نے قصبے کی کل مسلمان برادری کو دعوت دی۔ رات کے وقت سب لوگ جمع ہوگئے۔ میں بھی گیا۔ گیارہویں کی نیاز ہوئی۔ میں آنگن میں بیٹھا رہا۔ اسحٰق اس رات بیحد خوش تھا۔ میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر وہ میری بغل میں آ بیٹھا اور مجھ سے بولا، 'تم گیارہویں پڑھنے نہیں گئے؟ ٹھیک ہی ہے۔ تم تو نماز روزے تک سے فارغ ہو۔'

کہتی ہیں، مجھے عقل نہیں ہے۔ میں پرانے فیشن کا آدمی ہوں۔ پرانے فیشن کے کپڑے پہنتا ہوں۔ پرانے خیالوں پر چلتا ہوں تو پھر کیا کیا جائے؟ اور عورت کے بغیر اپنے کو چین نہیں پڑتا۔ اس کا کیا کیا جائے!'

'اچھا، یہ بات ہے؟ اس لئے تم نے لکشمی کو رکھ لیا ہے؟'

'ایک وہی ہے جو مجھے سمجھتی ہے۔ اس میں میرا کیا قصور؟ تم گاؤں والے بھی کمال کرتے ہو۔ یعنی جو پاس آنا چاہتی ہے اسے زبردستی دور کرنے کو کہتے ہو! لیکن جو میرے پاس نہیں آتیں، انہیں زبردستی میرے پاس نہیں لاتے!'

یہ کہہ کر اسحٰق ہاہا کر کے ہنسا۔ پھر میری پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا، 'گیارہویں کے بعد لوگوں کے جاتے ہی لکشمی یہاں آجائے گی! وہ مستقل یہیں رہے گی۔ اگر تم کچھ دن گاؤں میں رہے تو خود دیکھ لوگے اور تمہیں جلدی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے بابا کے لئے میٹھا کھانا دوں گا، وہ لے کر جانا۔'

میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ گیارہویں ختم ہوئی۔ میٹھا کھانا بانٹا گیا۔ میں نے کھایا اور گھر لے جانے کے لئے اسحٰق کے برتن کی راہ دیکھنے لگا۔ لوگ اپنے اپنے گھر لوٹنے لگے۔ دو چار آدمی رہ گئے اور تب میں نے لکشمی کو اندھیرے سے ڈرتے ڈرتے نکل کر نئے مکان میں داخل ہوتے دیکھا۔ چند منٹ بعد اسحٰق اندر سے برتن لئے نکلا۔ میں اسے لے کر روانہ ہوا اور سڑک کی طرف مڑ گیا۔

اچانک سامنے سے پندرہ بیس آدمی تیزی سے میری طرف آئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا اور میں ایک طرف ہوگیا۔ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ میں نے انہیں سیدھے اسحٰق کے گھر میں گھستے دیکھا۔ ان کے پیچھے میں بھی واپس اس طرف جانے لگا۔ لیکن وہ پل بھر میں باہر نکل آئے اور لکشمی کو کھینچتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ واپس جاتے ہوئے وہ آنگن میں میرے پاس سے گزرے۔ ان میں مجھے قصبے کے کچھ بودھوں اور کلواڑیوں کے چہروں کی جھلک دکھائی دی۔ اسحٰق اندر سے چلاتا ہوا باہر نکلا اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں آکر ٹھٹک کر رک گیا۔ اندھیرے میں آگے بڑھنے کا اسے حوصلہ نہیں ہوا۔

یہ سب کچھ اتنی غیر متوقع طور پر اور اتنی تیزی سے پیش آیا کہ مجھے کئی منٹ تک اپنی جگہ سے ہٹنے کا

بھی خیال نہ آیا۔ اسحاق میرے بازو کو گرفت میں زور زور سے ہلاتے ہوئے قابل رحم غصے سے کہہ رہا تھا،

'دیکھا تم نے؟ وہ لکشمی کو اٹھا لے گئے ہیں۔ میں اس کا بدلہ لئے بغیر نہیں رہوں گا۔'

میں نے اسے سمجھانے کی بے سود کوشش کی۔

'دیکھو! اب وہ چلی گئی نا؟ جانے دو، سمجھ لو جھک جھک ختم ہوگئی، اب اس کا خیال چھوڑ دو۔'

'اس کا خیال چھوڑ دوں؟ ارے واہ! اسحق نے مجھ پر بھڑک کر کہا۔' کیا میں نے اسے زبردستی گھر میں رکھا تھا؟ زبردستی ان لوگوں نے کی ہے یا میں؟ وہ اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں انہیں مزہ چکھائے بغیر نہیں رہوں گا۔'

'لیکن کرو گے کیا؟' میں نے اس سے پوچھا۔

'اسے واپس لاؤں گا۔'

'کیسے؟ ارے تمہیں کیسے پتہ چلے گا ان لوگوں نے اسے کہاں رکھا ہے؟ اور اگر پتہ چل بھی گیا تو اسے لانے کے لئے تمہیں بھی ان کی طرح کسی کے گھر میں گھسنا پڑے گا۔ مطلب، اور جھگڑا ہوگا اور یہ سب کرنے کے لئے تم یہاں رہو گے کہاں؟ تم نے نیا مکان بنوایا ہے، اس میں اکیلے رہتے ہو۔ تمہارے افریقہ جانے کے بعد گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ لکشمی؟ اس کے بجائے تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ گھر میں گھر والی کو لاؤ۔ گھر اس کے حوالے کرو اور بے فکر ہو کر چلے جاؤ۔'

'ہرگز نہیں! میں کل جماعت کی بیٹھک بلاؤں گا۔ ان سے انصاف مانگوں گا۔ سالے گھر میں گھس سے لکشمی کو اٹھا لے گئے! آج اسے لے گئے ہیں، کل ہماری بیویوں کو اٹھا لے جائیں گے۔'

اس سے بحث کرنا لاحاصل تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے گھر کی سیڑھیاں اترا اور چل دیا۔

دوسری دن مسلمانوں کی جماعت کی بیٹھک ہوئی۔ مجھے دو تین بار بلاوا آیا، مگر میں نہیں گیا۔ جماعت کی بیٹھک ہمارے گھر کے پاس ایک عمارت میں ہو رہی تھی اور وہاں ہونے والے شور شرابہ مجھے گھر بیٹھے سنائی دے رہا تھا۔ لیکن اس شور میں مجھے کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بھابی سے پوچھا،' کیا طے ہو رہا ہے؟'

اس نے کہا،' میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ کیوں نہیں گئے؟'

'میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی الٹی سیدھی بات طے نہ ہو جائے۔'

'شور تو اتنا ہے کہ لگتا ہے کوئی بات طے نہیں ہو پا رہی ہے۔'

ٹھیک اسی وقت شور تھم گیا۔ اس بیٹھک میں ماضی کی ساری باتیں دہرائی گئیں۔ بودھوں اور کلواڑیوں سے معافی مانگنے کا مطالبہ کرنے کا متفقہ فیصلہ کیا گیا۔

مجھے ہونے والے واقعات کی رفتار محسوس ہونے لگی۔ مجھے لگا انہیں ہونے سے روکنا کسی کے بس میں نہیں ہوگا۔ مجھے خیال آیا کہ اب مجھے بمبئی چلے جانا چاہئے، یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ لیکن اس طرح چلے جانا مجھے بزدلی محسوس ہوا۔

لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں رہ کر بھی کیا کر لوں گا۔ میرا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ مجھ سے کوئی کچھ نہی پوچھ رہا تھا۔ میری صلاح کوئی نہیں ماننے والا تھا! ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ میری رائے اب پھینکنے کے لائق ہوگئی تھی یا لوگوں کے لئے ناقابل قبول ہو چکی تھی۔

پچھلے پندرہ برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ وقت کے طوفان میں بہت سی اچھی بری چیزیں ختم ہوگئی تھیں اور اس کے بہت سی نئی اچھی بری چیزیں وجود میں آ گئی تھیں اور میں دونوں سے ڈر رہا تھا۔ میں خود کو 'اسٹیٹس کو' کا حامی پا رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ میں خود کیا چاہتا تھا۔ ان تبدیلیوں نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک طرح کا ڈبل رول ادا کر رہا ہوں۔ خیالات کے لحاظ سے سے بہت آگے نکل گیا تھا اور طرز عمل کے لحاظ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ قصبے میں میرا رہنا بالکل بے معنی تھا اور میرے بمبئی چلے جانے کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اس کے باوجود مجھے بمبئی چلے جانا ٹھیک محسوس نہیں ہوا۔ یہاں رہ کر بھی میں کچھ کر نہیں سکتا تھا، لیکن بھاگ جانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ میں بزدل نہیں کہلانا چاہتا تھا۔ سمتی کے یہ لفظ مجھے بار بار یاد آتے تھے،' گورے اسی طرح بھاگ گیا تھا!' یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنا گھر بنانے یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ اسے گھر بنانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سمتی سے شادی کر کے وہ اسی کے گھر میں رہ سکتا تھا لیکن وہ اس کے بجائے بمبئی میں ٹین کی چھت والی چھوٹی سی کھولی میں رہ رہا تھا۔ اس نے کسی ڈاکٹر کے پاس کمپاؤنڈری کرنے

کو ترجیح دی تھی۔ میری حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ میں بھی گھر میں بیٹھا اپنی بے عملی کا ماتم کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پورا گاؤں میری بانجھ حالت کا مذاق اڑا رہا ہے۔

اور تب ایک دن ہر بار راؤ بابا سے ملنے آیا۔ وہ بابا کے پاس بیٹھا، دیر تک دھیمی آواز میں باتیں کرتا رہا اور دوسرے دن گاؤں میں سمجھوتے کی بات چیت شروع ہوگئی۔

مگر بات شروع ہونے سے پہلے ہی دن پیچ پڑ گیا۔ جیسا طے ہوا تھا اس کے برخلاف بودھ بات چیت کے لئے آئے ہی نہیں۔ پھر مسلمانوں نے انہیں بلاوا بھیجا۔ بودھ آئے تو کلواڑیوں کے نہ ہونے کے باعث بات چیت شروع نہ ہوسکی۔ ان کو کئی بار بلاوا گیا تب چوتھے پانچویں دن وہ حاضر ہوئے لیکن اس وقت تک ان کے نہ آنے سے مسلمان چڑھ گئے تھے۔ چنانچہ جب کلواڑی آئے تو مسلمانوں نے میٹنگ کا بائیکاٹ کر دیا۔ آخرکار جب تینوں فریقوں کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ہاتھ آیا تب سنجیدگی سے بات چیت شروع ہوئی۔

بات چیت کئی دن چلتی رہی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دوبار بات چیت ختم ہوتے ہوتے بچی۔ پھر کسی نے کوشش کرکے اسے دوبارہ شروع کرایا۔ مسلمانوں نے اسحاق کے مکان میں زبردستی گھسنے پر کلواڑیوں کے خلاف مقدمہ کرنے کی دھمکی دی اور کلواڑیوں نے جواب دیا کہ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ایک طرف بات چیت چل رہی تھی اور دوسری طرف قصبے کا ماحول اور زیادہ تناؤ بھرا ہوتا جا رہا تھا۔

اور ایک دن اچانک مسلمانوں نے اپنے پاس کام کرنے والوں میں سے کچھ کو نکال دیا۔ ان کی جگہ وہ قصبے کے باہر سے دوسرے آدمی لے آئے۔ تب میں خاموش نہ رہ سکا۔ میں نے بابا سے کہا، 'ان سے کہئے کہ ان لوگوں کو کام پر واپس رکھ لیں۔'

انہوں نے میری طرف تیز نگاہ سے دیکھ کر پوچھا، 'کیا تم ان سے کہو گے؟'

'ہاں، کہوں گا لیکن آپ بھی کہئے۔'

'میں ایک بار کہہ چکا ہوں۔ وہ سننے کو تیار نہیں ہوئے۔ تم بھی کہہ کے دیکھ لو لیکن وہ ماننے والے نہیں۔'

'کس سے کہوں؟'

'اسحاق سے۔ وہی لیڈر ہے۔'

اس دن میں کئی دن بعد گھر سے باہر نکلا اور

> پچھلے پندرہ برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ وقت کے طوفان میں بہت سی اچھی بری چیزیں ختم ہوگئی تھیں اور اس کے بہت سی نئی اچھی بری چیزیں وجود میں آ گئی تھیں اور میں دونوں سے ڈر رہا تھا۔ میں خود کو 'اسٹیٹس کو' کا حامی پا رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ میں خود کیا چاہتا تھا۔ ان تبدیلیوں نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک طرح کا ڈبل رول ادا کر رہا ہوں۔ خیالات کے لحاظ سے سے بہت آگے نکل گیا تھا اور طرز عمل کے لحاظ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ قصبے میں میرا رہنا بالکل بے معنی تھا اور میرے بمبئی چلے جانے کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔
>
> اس کے باوجود مجھے بمبئی چلے جانا ٹھیک محسوس نہیں ہوا۔ یہاں رہ کر بھی میں کچھ کر نہیں سکتا تھا، لیکن بھاگ جانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ میں بزدل نہیں کہلانا چاہتا تھا۔ سمتی کے یہ لفظ مجھے بار بار یاد آتے تھے، 'گورے اسی طرح بھاگ گیا تھا!'

اسحاق کے گھر گیا۔ وہ اپنے نئے مکان کے آنگن میں بیٹھا تھا اور باہر گاؤں سے بلوائے ہوئے مزدور سے جلانے کی لکڑیاں کٹوا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دھیان نہیں دیا۔ میں نے ہی اس کو آواز دی۔ 'اسحاق! ذرا ادھر تو آؤ۔ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'

'کیا ہے؟' اس نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے زور سے پوچھا۔ اس کے تپے ہوئے لہجہ سے میں سمجھ گیا کہ وہ میرے آنے کا مقصد بھانپ گیا ہے۔ میں آگے بڑھا اور اس کے پاس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

'کیا کام ہے؟' اس نے پھر پوچھا۔

'تم نے گاؤں کے مزدوروں کو کام سے کیوں نکال دیا؟' میں نے پوچھا۔

'اچھا، کیوں نکالا!' اس نے زہرناک لہجے میں کہا اور ایک طرف جا کر تھوکا۔ 'تمہیں نہیں معلوم؟ ان کی اور ہماری دشمنی چل رہی ہے۔ کیا ایسے دشمنوں کو پالیں گے ہم؟'

'ارے، لیکن سمجھوتہ کی بات چیت چل رہی ہے نا؟ پھر بلاوجہ جلتی پر تیل ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟'

'وہ لوگ تو جھک مار رہے ہیں۔ ہمیں اس کی پروا نہیں ہے۔ انہوں نے میرے گھر میں گھس کر لکشمی کو زبردستی اٹھا لیا۔ اس کے لئے انہیں معافی مانگنی چاہئے۔ باقی میں کچھ نہیں جانتا۔ اور یہ سمجھوتے کی بات چیت کس نے شروع کرائی۔ ہر بار راؤ اور تمہارے بابا نے۔ تمہارے بابا کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہر چیز میں دخل دیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ فخرو چاچا، اب آپ بوڑھے ہوگئے ہو۔ آپ کو ان چیزوں کی کوئی سمجھ نہیں ہے۔ آپ کچھ مت بولو لیکن وہ سنتے ہی نہیں۔ اپنی ہی چلاتے ہیں۔ کہتے ہیں، گاؤں میں جھگڑا نہیں ہونا چاہئے۔ ارے لیکن کس گدھے کو جھگڑا کرنے کا شوق ہے؟ یہ لوگ معافی مانگ لیں۔ جھگڑا ختم ہوجائے گا۔ بوڑھے آدمی ہیں۔ ان سے کچھ زیادہ کہنا اچھا نہیں لگتا اس لئے ہم چپ رہے۔'

'لیکن تمہیں یہ جھگڑا سلجھانا ہے یا نہیں؟'

'ہاں، بالکل سلجھانا ہے۔'

'پھر آدمیوں کو نکالنے سے جھگڑا کیسے سلجھے گا؟'

'بالکل سلجھے گا۔ ان سالے بودھوں او رکلواڑیوں کو بھوکا مرنے دو۔ پھر دیکھو کیسے سیدھے ہوتے ہیں۔'

'ایسا نہیں ہوگا۔ بات بڑھ جائے گی۔' (بشکریہ 'آج')

(جاری)

ہندستان ایک بہت بڑا ملک ہے، آبادی کے اعتبار سے بھی اور رقبے کے لحاظ سے بھی۔ آبادی تقریباً سوا ارب ہوچکی ہے جو مختلف مذہبوں پر مشتمل ہے۔

زبانوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو مغرب سے مشرق اور جنوب سے شمال تک تقریباً ۱۶۵۲/زبانیں اور بولیاں یہاں کے باشندے بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں۔

یہ ان زبانوں کا ہی اعجاز ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروکار ہونے کے باوجود یہاں کے باشندوں میں آپس میں اتحاد، یگانگت اور ایکتا کا ایک مشترک احساس پایا جاتا ہے جو دوسرے ممالک میں شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہو۔ ابتدا ہی سے یہاں کے باشندوں میں یہ مشترک احساس فروغ پاتا رہا ہے۔

مختلف علاقوں اور مذاہب کے پیروکار اپنی ضروریات کے ساتھ جب ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں تو ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات اور اپنی بات کو مضبوطی سے اپنے سامنے والے فریق کو سمجھانے کے لیے جس شدّت، محبت اور یگانگت سے پیش آتے ہیں اس سے دھیرے دھیرے ایک نئی زبان وجود میں آنے لگتی ہے۔

اردو زبان بھی اسی طرح وجود میں آئی اور آہستہ آہستہ نہ صرف ایک مخلوط و مشترکہ زبان (n c a Lingua fra) بنتی چلی گئی بلکہ یہاں کے عوام کے دلوں پر اپنی شیرینی اور لطافت کے سبب ان کے دلوں پر راج کرنے لگی۔

چنانچہ جب اردو زبان میں شاعری اور نثر لکھنے کا رواج شروع ہوا تو نہ صرف مسلمان بلکہ وہ غیر مسلم حضرات بھی اس زبان میں اپنے تجربات، احساسات اور جذبات قلم بند کرنے لگے جو اس زبان کے معترف ہو چکے تھے۔

دیپک بُدکی ایک معروف افسانہ نگار ہیں۔ اپنے افسانوں میں وہ جس تخلیقی زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ ان کو ہم عصروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ اب تک ان کے سات افسانوں کے مجموعے شائع ہوکر اہل نظر سے خراج تحسین وصول چکے ہیں۔ وہ نرے افسانہ نگار ہی نہیں ہیں بلکہ ایک بالغ نظر نقاد اور محقق بھی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی تین تنقیدی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں مختلف ادبا اور شعرا کی تخلیقات پر انھوں نے اپنی بے لاگ اور بے باک رائے کا اظہار مکمل دلائل اور براہین کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے۔

اب تازہ تصنیف 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار'، جو ایک تحقیقی کام ہے، پر انھوں نے بڑی سنجیدگی اور عرق ریزی کے ساتھ کام کیا ہے جس میں ایسے ایسے کہانی کاروں کو تلاش کیا ہے جن کو اردو کے قارئین ہی نہیں بلکہ ان کے احفاد بھی بھلا چکے ہیں۔ ان کہانی کاروں نے تقسیم

مصنف : دیپک بدکی
مبصر : ڈاکٹر ذکی طارق
قیمت : 450روپے
ملنے کا پتہ : میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس
بالمقابل فائر سروس ہیڈ کوارٹر، سرینگر، کشمیر

ملک کے بعد جب اردو زبان بیگانہ ہوکر رہ گئی تھی، تب بانگ دہل دشمنان اردو کو یہ یقین دلایا کہ اس زبان نے ہندستان کی مٹی سے جنم لیا ہے اور بڑی بے خوفی کے ساتھ اردو کا پرچم لے کر اردو زندہ باد کے نعرے ہی نہیں لگائے بلکہ اپنے جذبات و احساسات کو اس زبان میں قلم بند کر کے صفحۂ قرطاس کی زینت بنا کر اردو زبان و ادب کو مالا مال کر دیا۔

زیر نظر تصنیف میں شامل بہت سے قلم کار بے حد معروف ہوئے اور ادب کا حصہ بنے۔ اگر ہم افسانے کے مصنفین پر ہی غور کریں تو پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، دیویندر ستیارتھی، اوپندر ناتھ اشک، سدرشن اور جمنا داس اختر ایک طویل فہرست ہے جن کے ذکر کے بغیر افسانے کی تاریخ مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن بُدکی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ڈھیر سارے ایسے نام بھی کھوج نکالے جنھوں نے کم لکھا، لیکن کارآمد لکھا اور وہ اس قابل تھے کہ افسانے کی تاریخ میں شامل ہوسکیں۔

علاوہ ازیں انھوں نے ایسے گمنام افسانہ نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے جن کا مجموعہ تو نہیں شائع ہوسکا البتہ ان کی کہانیاں مختلف رسائل، کالج میگزینوں یا مجلّوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ مرد مصنفین کے ساتھ انھوں نے خواتین کہانی کاروں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔

بُدکی صاحب نے مشمول افسانہ نگاروں کے کوائف کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقات پر مختصر گفتگو کرتے ہوئے مشاہیر کی آرا بھی درج کی ہیں جس سے یہ ایک حوالہ جاتی کتاب تیار ہوگئی ہے جو آنے والے وقت میں ان طلبہ کے کام آئے گی جو ان مصنفین پر کوئی تحقیقی کام کرنا چاہیں گے۔ ان طلبہ کو خام مواد اور اشاریہ بھی دستیاب ہوگا۔

کتاب میں شامل افسانہ نگاروں کے حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف میں عالمی انسانیت کا حوالہ ہے، سماجی اور ثقافتی تذکروں کے ساتھ آدم و حوا کی جذباتی کیفیت کا ذکر ہے۔ عورتوں کے تئیں ہمدردی کا اظہار بھی ہے اور مرد کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والی گفتگو بھی۔ روایت کی پاسداری بھی ہے اور مشرقی قدروں کا احترام بھی۔ بعض کہانی کار متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں تو بعض نے سماج کے ایسے لوگوں کو اپنے قلم کا نشانہ بنایا ہے جو سماج کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

غرض کہ دیپک بُدکی کی یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔ افسانے کے حوالے سے اس کتاب میں وہ تمام مواد موجود ہے جس کی افسانے کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک تاریخ داں کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' اردو دنیا میں نہ صرف پسند کی جائے گی بلکہ اردو کی ہر لائبریری کی زینت بنے گی۔

❑❑❑

’رامپور میں اردو مثنوی‘ ڈاکٹر جمیل دوشی کے تحقیقی مقالے برائے پی ایچ ڈی ’اردو مثنوی کے فروغ میں رامپور کا حصہ‘ کی از سرنو ترتیب شدہ شکل ہے۔ زیر نظر کتاب بارہ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں رامپور کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں اردو مثنوی کے ارتقاء کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے۔ باب تین سے لے کر باب دس تک رامپور کی اردو مثنویوں کا عہد وار تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا باب نواب فیض اللہ خاں کے عہد پر مشتمل ہے جس میں ان کے عہد میں تصنیف کی گئی دونوں مثنوی ’مثنوی کبیر‘ از حکیم کبیر علی کبیرؔ انصاری سنبھلی اور مثنوی ’پدماوت‘ از حکیم ضیاء الدین عبرتؔ و میر غلام علی عشرتؔ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھا باب نواب احمد علی خاں رندؔ کے عہد پر مشتمل ہے۔ اس میں اس زمانے میں تحریر کی گئی بارہ مثنویوں کا تذکرہ ہے۔ ان مثنویوں میں ’یاقوت سخن‘ از غلام حیدر خاں حیدرؔ رامپوری، مثنوی ’دل سوز‘ از کفایت اللہ خاں رامپوری، مثنوی ’نسخۂ یاقوت‘ از محمد ناصر خاں ناصرؔ رامپوری، مثنوی ’فراق نامہ‘ از امام الدین خاں انورؔ رامپوری، مثنوی ’کنز العابدین‘ از محمد ناصر خاں حشمتؔ رامپوری، مثنوی ’شکار نامہ‘ از شاہؔ رامپوری، مثنوی ’نور نامہ‘ اور مثنوی ’معجزۂ یمنی‘ از سید امیر شاہ امیرؔ رامپوری، مثنوی ’خواص ادویہ‘ از حکیم یوسف رامپوری، مثنوی ’بلا عنوان‘، مثنوی ’آئینۂ جم‘ اور مجموعۂ مثنویات کرم از کریم اللہ خاں کرمؔ رامپوری شامل ہیں۔

پانچویں باب میں نواب سعید خاں کے عہد کا تذکرہ ہے اور اس دور میں تصنیف کی گئی دونوں مثنویوں ’مثنوی جمال از محمد جمال خاں رامپوری اور مجموعۂ مثنویات گرمؔ از محمد مظفر خاں گرمؔ رامپوری‘ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھٹا باب نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے عہد پر مشتمل ہے اور اس دور میں تخلیق کی گئی واحد مثنوی ’مظہر العجائب‘ از سید مظفر حسین ضمیرؔ کا بھرپور تعارف پیش کرتا ہے۔ ساتواں باب رامپور میں مثنویوں کی تخلیق کے اعتبار سے سب سے اہم باب ہے۔ یہ باب نواب کلب علی خاں کے عہد پر مشتمل ہے۔ اس دور میں سترہ مثنویاں تصنیف کی گئیں جو اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے بیحد اہم ہیں۔ ان میں سات مثنویاں تو امیر مینائی کی تصنیف کردہ ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

مثنوی کارنامۂ عشرت، ابر کرم، نور تجلی، قصۂ یہودی، مثنوی در تہنیت جشن مسند نشینی نواب کلب علی خاں اور مثنوی در تہنیت خلعت پوشی نواب کلب علی خاں۔ دو مثنویاں امیر اللہ تسلیم کی تصنیف کردہ ہیں جن کے نام ’سنبلستان خیال‘ اور ’تواریخ بدیع‘ ہیں۔ اسی باب میں نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی کی مشہور مثنوی ’فریاد داغ‘ شامل ہے۔ یہ مثنوی عشقیہ جذبات کی عکاسی بڑے پر اثر انداز میں کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ان کی حقیقی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لئے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں سعادت رامپوری کی ’منقبت غوثیہ‘ محمد مبارک علی خاں عاصیؔ کی مثنوی ’عجیب‘، حکیم احمد خاں فاخرؔ رامپوری کی مثنوی ’فاخر‘، مولانا حفظ اللہ بندہؔ کی ’مولود خیر الوریٰ‘، حکیم ضامن علی جلالؔ کی ’در تہنیت جشن باغ بے نظیر‘ میر وحید خاں کی مثنوی ’مثنوی وحید‘ کے علاوہ

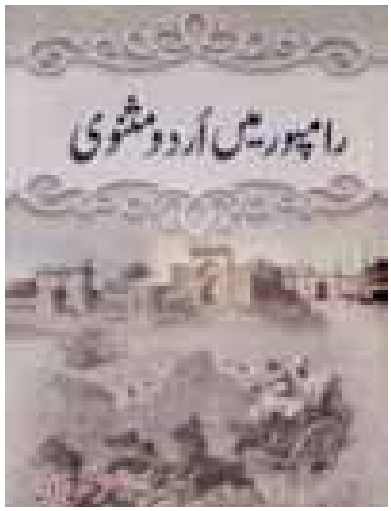

مصنف : ڈاکٹر جمیل دوشی
مبصر : نجیب انصاری
قیمت : 699 روپئے
ناشر : گٹن برگ، وکٹوریہ اسٹریٹ، چوک لکھنؤ
ملنے کا پتہ : گٹن برگ، وکٹوریہ اسٹریٹ، چوک لکھنؤ

ایک نامعلوم شاعر کی مثنوی ’معجزۂ آل نبی‘ شامل ہے۔

کتاب کے آٹھویں باب میں نواب حامد علی خاں رشکؔ کے عہد اور اس میں تصنیف کی گئی تیرہ مثنویوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان تیرہ مثنویوں میں تین مثنویاں ’خون مسرت‘، ’طلوع و غروب‘ اور ’خون ثلاثہ‘ محمد اسماعیل خاں صبرؔ رامپوری کی تصنیف کردہ ہیں۔ باقی دس شاعروں کی ایک ایک مثنوی شامل ہے جس میں امیر مینائی کی ’حکایت اویس قرنی‘، نواب صفدر علی خاں کی ’گلدستۂ معرفت‘، مولوی واحد نور کی ’آئینۂ عبرت‘، مرتضیٰ ثابتؔ رامپوری کی ’نظم المعجزات‘، امیر اللہ تسلیم کی ’سفر نامۂ خسروی‘، ابراہیم علی خاں جنونؔ رامپوری کی ’مرقع ناز‘، خلیفہ معظم عباسی کی ’جنگ نامہ دو جوڑہ‘، اسی نام کی تسلیمؔ رستم نگری کی ایک اور مثنوی، حیدر حسن خاں حیدرؔ رامپوری کی ’میزان الآخرت‘ اور سید محمد داؤد کمال الحسنی کی مثنوی ’ید بیضا‘ شامل ہیں۔ نواں باب نواب رضا علی خاں رجاؔ کے عہد پر مشتمل ہے جس میں صرف ایک مثنوی ’غذائے روح‘ از حیدر حسن خاں حیدرؔ رامپوری کا تذکرہ ہے۔ دسویں باب میں انضمام ریاست کے بعد رامپور میں تصنیف کی گئی مثنویوں کا تذکرہ ہے۔ اس دور میں صرف دو مثنویاں ’دیباچۂ نغم عرف سنہری کرن‘ از ادب فیضی اور ’مناقب خواجہ‘ از سید محمد علی موجؔ کا تذکرہ ہے۔ گیارہویں باب میں مثنویات رامپور کا فنی و تکنیکی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ باب اپنے موضوع کے اعتبار سے بیحد اہم ہے۔ اسی باب میں مثنویام کے اقسام پر بھی گفتگو کی گئی ہے اور مجموعی طور پر رامپور میں تصنیف کی گئی مثنویات کی زبان و بیان پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ بارہویں باب میں مثنویات رامپور کا سماجی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزے میں اس عہد کے رہن سہن، رسم و رواج، آرائش و زیبائش اور سماجی اقدار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ثقافتی نقطۂ نظر سے یہ ایک اہم باب ہے۔ بقول مصنف ’اگر ریاست یا مابعد ریاست رامپور کا کسی بھی طور پر سماجی، ثقافتی یا اخلاقی معیارات کے اعتبار سے مطالعہ کرنا ہو تو بہر حال ادب کی دیگر اصناف مثلاً داستان کے ساتھ مثنویات کا مطالعہ از بس ناگزیر ہوگا‘

کتاب کا آخری باب اختتامیہ کے عنوان سے ہے جس میں بہ یک نظر رامپور کی مثنویات سے واقف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ باب پوری کتاب کا نچوڑ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہی قاری کو کتاب کے مشمولات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مقالہ انتہائی محنت اور عرق ریزی سے تحریر کیا گیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل دوشی نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ مقالہ کی کتابت، طباعت اور سجاوٹ انتہائی دیدہ زیب ہے۔ کہیں کہیں پروف کی چھوٹی موٹی غلطیاں رہ گئی ہیں جیسے وفا شعار کی جگہ پر وفا شکار، اخبار الصنادید کی جگہ اخبار السنادید، امتداد زمانہ کی جگہ پر اعتداد زمانہ کمپوز ہو گیا ہے۔ بعض مصرعوں میں ایک آدھ لفظ چھوٹ گیا ہے جس سے مصرعہ ناموزوں ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض جگہ مثنوی کی جگہ مصنوی تحریر ہو گیا ہے لیکن اس سے مقالہ کی اہمیت و افادیت کم نہیں ہوتی۔ ذوق سلیم اور موزونیٔ طبع رکھنے والے قاری از خود درست کر لیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شعر و ادب کی تحقیق بالخصوص مثنوی سے دلچسپی رکھنے والیوں کے لئے اس کا مطالعہ یقیناً ان کی معلومات میں اضافہ کرے گا۔ مزید برآں یہ کہ مثنوی پر کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب مشعل راہ شامل ہوگی۔ □□□

'نیا دور'ہندوستان کے بیشتر اہم شہروں کی ایجنسیوں پر دستیاب ہے۔ایجنسیوں کی فہرست شائع کی جارہی ہے۔

لکھنؤ میں 'نیا دور' مندرجہ ذیل مقامات سے خرید ا جاسکتا ہے

۱ محمد نعیم
دانش محل، سنٹرل ہوٹل، مقابل زیرزمین پارکنگ،
امین آباد لکھنؤ Mo.9792361533

۲ مولانا محمد وکیل ندوی
علامہ شبلی لائبریری، دارالعلوم ندوۃ العلماء
ٹیگور مارگ، ڈالی گنج لکھنؤ۔226007

۳ سید محمد سرور
عرش ایسوسی ایٹس، خواجہ ٹاور، نزد وی
مارٹ، وکٹوریہ اسٹریٹ، نخاس لکھنؤ

۴ نظامی پریس
نزد شیعہ کالج، وکٹوریہ اسٹریٹ
نخاس لکھنؤ

۵ مولانا اسیف جائسی
نور ہدایت فاؤنڈیشن، امامباڑہ، غفرآنمآب
چوک لکھنؤ 8736009814

۶ ادارہ تنظیم المکاتب
ریڈ گیٹ بلڈنگ، جگت نارائن روڈ،
گولہ گنج لکھنؤ

ہندوستان کے دیگر شہروں کی ایجنسیاں

۱ جناب اسد یار خان
ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002
موبائل۔96341 05087

۲ جناب طالب حسین
ایف۔ڈی۔انٹر کالج، کاٹھ دروازہ،
مراد آباد۔ 244001، یوپی۔
موبائل۔098372 25809

۳ ڈاکٹر نہال رضا
یوتھ فیڈریشن، عکسری کلینک، محلہ قاضیانہ،
پوسٹ رودولی ضلع۔فیض آباد۔ 224120
موبائل۔94151 52710

۴ جناب علی حسین ادریسی
ادریسیہ بک سینٹر،
نیوز پیپر ایجنٹ،
سنگت کلا، غازی پور سٹی۔ 233001 یوپی
موبائل۔93693 05266 .

۵ جناب محمد بدرالدین
ناولٹی بکس، علامہ اقبال چوک
قعلہ گھاٹ، دربھنگہ۔بہار . 846004

۶ جناب زکریہ ایاز
۱، پریم نگر، اورئی، جالون
موبائل۔ 9452452788

۷ جناب امتیاز انور
بک امپوریم، اردو سبزی باغ پٹنہ۔800004
موبائل۔93048 88739

۸ جناب ضمیر احمد
ضمیر بک ڈپو، قطب شیر، سہارنپور۔یوپی
098971 08075 .

۹ جناب روشن صدیقی
ناصر لائبریری، ابو بازار
اونچوا۔گورکھپور۔(U.P.) 273001
9451846364

۱۰ ڈاکٹر شکیل احمد
قاسم منزل، ڈومن پورا، چنگی
مؤناتھ بھنجن۔ 275101 -
Mo. 92367 22570

۱۱ جناب ایس۔ایم۔عباس ایڈوکیٹ
۸۸، تارتلہ، جونپور۔ 222001-
Mo. 98380 81405

۱۲ جناب بھونی پرساد گپتا،'ویدھ'
سابق نامہ نگار،'ترون بھارت'
اترولہ، بلرامپور (U.P.) 271604

۱۳ میسرس کمالیہ بک ڈپو
تاتارپور، بھاگلپور۔بہار،812002
Mo. 93341 90757

۱۴ جناب کامل مجید
محلہ چاہ میر، مقابل نواب دولہے کی کوٹھی، بدایوں
Mo. 94102 93406

۱۵ جناب ساغر وارثی
ایمن زئی، جلالپور، شاہجہانپور
Mo. 93691 90785

۱۶ میسرس انیس بک ڈپو
۷/۱، محلہ۔آٹالہ، الٰہ آباد۔
Mo. 93351 68463

۱۷ جناب عباد احمد ایڈوکیٹ
جج صاحب کا پھاٹک، مولوی ٹولہ
فانی روڈ، بدایوں۔243601
Mo. 94124 08110

۱۸ عارف علی بک سیلر
لطیف مارکٹ، خیرآباد
ضلع سیتاپور۔261131(U.P)
Mo. 93363 04064

۱۹ جناب ایس۔عزادار حسین نقوی
۲۵/۶۰، حضرت گنج، دریاباد
الٰہ آباد(U.P) 211003
Mo. 99198 16295

۲۰ میسرس پوجا پستک بھنڈار
سرائے میر، اعظم گڑھ۔276305
Mo. 94510 39177

۲۱ میسرس ہمدم بک اسٹال، مبارک پور
اعظم گڑھ، 92362 72662

۲۲ جناب محمد سلیم (جنرلسٹ)
پیر بٹاون (پھلواری)، بارہ بنکی
Mo. 94157 74724

۲۳ میسرس نظامی بک ایجنسی (نظامی پریس)
محلہ۔سوتھا، شکیل بدایونی روڈ، بدایوں
Mo. 93583 57370

۲۴	میسرس عامر کتاب سینٹر ۳۳۴۔ایچ، گلی نمبر۔۶، باٹلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی۔110025 Mo. 098110 29831
۲۵	میسرس قریشی نیوز ایجنسی جی۔بی۔ایچ۔مین روڈ، راؤ کیلا، اڑیسہ -760001 Mo. 94394 99458
۲۶	میسرس صالحہ بک ٹریڈیرس اینڈ اسٹیشنر جامع مسجد، مومن پورا ناگ پور، مہاراشٹر۔, 440018 Mo. 07122 721069
۲۷	میسرس راعین بک ڈپو ۳۴۷، کٹرہ، الہٰ آباد، (U.P). 211003 Mo. 99365 16895
۲۸	جناب بصر الدین سکریٹری غالب لائبریری، ۶، غالب نگر فیروز آباد، -(U.P).283203 Mo.94562 39242
۲۹	ڈاکٹر وجہ القمر صدیقی جے۔کے کالونی، لولی پور، حنیف نگر لولی پور سلطانپور (U.P) .228001 Mo.94515 58318
۳۰	جناب تنویر تنویر بک ڈپو، ۱۱۲، جی۔ٹی۔روڈ آسن سول، مغربی بنگال- .713301 Mo. 98321 14440
۳۱	میسرس کتاب دار پبلکیشنس ۱۱۰۔۱۰۸، جلال منزل ٹمکر اسٹریٹ، ممبئی، 7400008
۳۲	خالد لائبریری نزد مسلم فنڈ ٹرسٹ، دیوبند، سہارنپور Mo.92863 64999
۳۳	میسرس ایم۔ایچ بک سیلر ہول سیلر اینڈ ریٹیلر، محلہ رحم گنج دربھنگہ۔846004 Mo. 094314 58429
۳۴	جناب ندیم اختر جن سیوا کیندر، پوسٹ۔گنج ڈنڈوارہ ضلع۔کاس گنج، (U.P) 207242
۳۵	میسرس خوشتر کتاب گھر پوسٹ، ہلور، سدھارتھ نگر- 272191 Mo. 94156 69624
۳۶	نور نبی بک سیلر اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ سی۔کے۔۱۰۱/۴۲، دال منڈی وارانسی۔(U.P) 221001 Mo-94153 55954
۳۷	جناب شہاب حسین 'جرنلسٹ' محلہ ناظر پورہ، بہرائچ۔ 271801 Mo- 94523 11999
۳۸	جناب محمد شوکت علی بک اسٹال ۲۱/اے، ایچ۔ایم۔ایم اسکوائر نزد مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا۔مغربی بنگال
۳۹	جناب خالد قیصر محلہ سریان،، پوسٹ محمدی۔ ضلع لکھیم پور (U.P).262804 Mobile .94155 62853
۴۰	میسرس جبلی بک سینٹر ۱۱۹/۱۰۵، جبلی کالج روڈ چمن گنج، کانپور (U.P).208001 Mo. 09336720718
۴۱	میسرس سحر بک ایجنسی وثیقہ عربک کالج، راٹھ حویلی، ضلع فیض آباد۔ 224001.(U.P), Mo.95653 83714
۴۲	جناب خبیب حسن کمرہ نمبر ۲۲۳، جامعہ سلفیہ، ریوری تالاب بی۔۱/۱۸، جی، وارانسی۔ 221010 Mo . 95576 3570014
۴۳	جناب ایس۔پرویز میسرس ہورائزن ڈسٹر بیوٹر ۱۴۔بی۔گوراچاند روڈ، کولکاتا۔700014 Mo. 9831311918
۴۴	جناب محفوظ الرحمن کنسٹرکشن ڈویژن۔۱، پی۔ڈبلیو۔ڈی ہردوئی۔-241001 Mo . 9451916715
۴۵	جناب اظہار ندیم عرشیہ پبلیکیشن، اے۔۱۷۰ گراؤنڈ فلور، ۳۔سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، نئی دہلی۔ Mo 9971775969
۴۶	میسرس۔سکندر نیوز ڈسٹر بیوٹر اینڈ سپلائر، لال چوک، شری نگر، جے اینڈ کے Mo. 9797797124
۴۷	میسرس کوثر ایجنسی ریاض خان، معرفت اکولہ پان بھنڈار پان مارکٹ، جنتا بازار، اکولہ۔ 444001 Mo. 098221 25888
۴۸	ماسٹر محمد سلیم شجاع ول پور، پوسٹ ڈنڈوارہ۔ ضلع کاس گنج۔ 207242 Mo. 9557996293
۴۹	جناب سالم رضوی معرفت۔عثمانیہ بک ڈپو ۱۲۵، ربیندرا سرائے، کولکاتہ۔۷۳ Mo. 09433050634
۵۰	جناب محبوب علی محلہ۔چکی ٹولہ، پوسٹ لہر پور ضلع سیتاپور۔261135 Mo. 95593 47469
۵۱	جناب حاجی نثار احمد شعبہ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی، پوسٹ۔سینٹرل یونیورسٹی، پروفیسر سی آر راؤ روڈ حیدرآباد۔500046 Mo. 09391062713
۵۲	جناب اشرف الحق انصاری اشرف نیوز ایجنسی، وارث پورا کامپٹی۔ناگپور۔441002 Mo. 08956697056
۵۵	مکتبۂ جامعہ اردو بازار، جامع مسجد، نئی دہلی۔۶

نیا دور کی ایجنسی صرف دس شماروں کی ایڈوانس رقم ڈرافٹ کے ذریعہ بھیج کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ایجنسیاں ۴۰ رفیصد کمیشن کی حقدار ہوں گی۔

آپ کے خطوط

پچھلے کئی مہینے سے ''نیا دور'' کے شمارے پابندی سے موصول ہو رہے ہیں جس کے لیے ایڈیٹر کا شکریہ لازمی ہے ۔تمام شماروں کے مشمولات کے پیش نظر ایڈیٹر صاحب کے ذوق انتخاب کی تعریف و تحسین بھی لازم ہے۔ستمبر کے شمارے میں سہیل وحید اور وقار رضوی صاحبان کی تحریریں بڑی دلچسپ ہیں جن میں اردو زبان کی ترقی میں عزت مآب گورنر رام نائک جی کی کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے۔مضامین کے گوشے میں تینوں مضامین معلوماتی ہیں جن میں نیلوفر حفیظ کا مضمون ''مغل دور میں فن صحافت کا ارتقاء'' قابل توجہ ہے ۔جس میں مغل حکمرانوں کی صحافتی سرگرمیوں کو تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔مرزا جعفر حسین کے مقالے ''فرنگی محل اور ندوۃ العلماء'' سے لکھنو کی تاریخ اور ادبی شخصیات کے متعلق معلومات فراہم ہوئیں ۔رسالہ مجموعی طور پر دیدہ زیب اور پرکشش ہے۔

شہناز رحمن (علی گڑھ)

اہل نظر بخوبی واقف ہیں کہ اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں رسالہ 'نیا دور' کا تاریخی ونمایاں کردار رہا ہے۔مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ گزشتہ چند برسوں سے نیا دور کے مخصوص قارئین ایک بے نام سی مایوسی کا شکار تھے۔لیکن خوشی ومسرت کا مقام ہے کہ 'نیا دور' کے ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔''نیا دور'' کی حیاتِ نو کے لیے میں جملہ ارکین بطور خاص محترم وضاحت حسن رضوی صاحب اور سہیل وحید صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔واقعہ کچھ یوں ہے کہ پچھلے دنوں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی کتب خانے میں ''نیا دور'' کے تازہ شمارہ پر نظر پڑی۔یقین جانیے دل کی ویرانیاں چمن زار میں یکسر تبدیل ہو گئیں۔در اصل دلکش و پرکشش سر ورق، معیاری مشمولات اور خوبصورت ترتیب وتنظیم سے آراستہ پیراستہ رسالے کی رگوں میں تازہ خون گردش کرنے لگا ہے۔نواز دیو بندی، مشرف عالم ذوقی، سراج اجملی، عالم خورشید، اشہر ہاشمی، ہلال نقوی اور سلیم اختر جیسے ادب کے آفتاب و ماہتاب کی تخلیقات رسالے کی زینت اور قدر و قیمت میں اضافہ کر رہی ہیں۔اس بات کا مخلصانہ اعتراف بھی لازمی ہے کہ آپ حضرات نے خصوص شمارے کے حوالے سے بھی جو کارہائے نمایاں انجام دیا ہے، وہ ادبی دنیا میں لائق صد افتخار ہے۔قوی امید ہے کہ دوسرے ادارے بھی آپ کے نقش قدم پر چلیں گے۔ میں ایک بار پھر سے ادارے جملہ اراکین کو صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔دعا ہے کہ اردو کے ہر دل عزیز ادبی رسالہ ''نیا دور'' زمانے کے نت نئے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کر سکے۔ آمین! نیک خواہشات کے ساتھ:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ڈاکٹر محبوب حسن (ورانسی)

ماہ ستمبر ۲۰۱۷ء کا تازہ ترین شمارہ سامنے ہے۔سبھی مشمولات غور وفکر کے متقاضی اور لائق توجہ ہیں۔گورنر جناب رام نائک کا انٹرویو کافی دلچسپ ہے۔اس انٹرویو کے ذریعہ اردو زبان کے تئیں ان کے لگاؤ سے واقف ہونے کا موقع ملا اور بے حد خوشی ہوئی۔اس شمارے میں شائع شدہ تمام غزلیں عمدہ ہیں، فانی کے کلام کا انتخاب بہترین ہے۔مضمون ''مغل دور میں فن صحافت کا ارتقاء'' کافی معلوماتی ہے۔ میڈیا سے متعلق مضامین بھی معلومات میں اضافے کا باعث ہیں۔

افسانہ ''بند لفاف'' حقیقت پر مبنی ہے۔دیگر افسانے بھی عمدہ اور مطالعے کے لائق ہیں۔ مزاحیہ ''شامت اعمال'' کافی دلچسپ ہے۔دعا ہے کہ یہ رسالہ اردو زبان کے فروغ میں معاون ثابت ہوگا اور روز بروز ترقی کے منازل طے کرے گا۔

عاتکہ ماہین (اے ایم یو، علی گڑھ)

اگست کا نیا دور دیکھ کر آنکھیں روشن اور دل شاد ہو گیا۔کیا کتابت، کیا طباعت، کیا آرائش، کیا زیبائش سب ہی تو نیا نظر آیا۔نیر مسعود سے انٹرویو کے اقتباسات پڑھ کر ان کے افسانوں تک رسائی کے رمز سے آشنا ہوا۔کرنل نظام الدین کے انتقال پر اخبارات میں خبریں پڑھی تھیں۔ان کے متعلق تفصیلات کی تلاش تھی سو وہ مبارک پور کے محمد رضا نے مہیا کر دی۔ان کا شکریہ اور انہیں مبارکباد بھی۔گوشۂ عصمت چغتائی کے تحت تو آپ نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی قابل تحسین کوشش کی ہے۔شعری حصہ اور افسانے رکھ چھوڑے ہیں بعد میں پڑھنے کے لئے تاکہ رسالہ جلد ختم نہ ہو جائے۔دعا گو ہوں کہ آپ کا ذوق جمال اور خوش سلیقگی قائم ودائم رہے۔

مشتاق اعظمی (اعظمی منشن، مغربی بنگال)

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔نیا دور سے میرا تعلق تقریباً تین دہائیوں سے ہے۔اس کے تمام خاص نمبر میری ذاتی لائبریری کی زینت ہیں اور میں مسلسل چھپتا بھی رہتا ہوں۔لکھنؤ سے محترم سلمان خان صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ آپ کی ادارت میں نیا دور پھر سے منظر عام پر آ گیا ہے۔سلمان صاحب نے بہت تعریف کی اور مجھے تاکید فرمائی کہ برائے اشاعت کچھ ارسال کر دوں۔اس کے مطالعہ کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ نیا دور ایک نئے دور میں داخل ہو چکا ہے۔تصاویر، جلی طباعت آپ کی ادارتی صلاحیتوں کا منھ بولتا ثبوت ہے۔مبارکباد قبول فرمائیں۔بس کسی طرح اسے ریگولر کر دیجئے۔

راشد جمال فاروقی (رشی کیش، اتراکھنڈ)

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ اپنے ایک شناسا کے توسط سے نیا دور کے تین شمارے بابت مئی، جون اور جولائی ۲۰۱۷ء دستیاب ہوئے۔ نیا دور سے میرا تعلق اپنی طالب علمی کے دور سے رہا ہے۔ آج جو تقریباً ۴۰-۴۲ سال کے عرصہ پر محیط ہے اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ایک طویل مدت تک نہ صرف اس کا سالانہ خریدار رہا بلکہ اب تک اس کے جتنے خصوصی نمبرات شائع ہوئے وہ نہ صرف میرے پاس محفوظ ہیں بلکہ مجلد بھی ہیں۔ جن سے گاہے بگاہے میں مستفید بھی ہوتا رہتا ہوں۔ ہر چند کہ راقم کو پڑھنے کے علاوہ لکھنے سے زیادہ سروکار نہیں رہا تاہم وقتاً فوقتاً کچھ مضامین تحریر کئے جن میں بھی آپ یہاں سے شائع ہونے والے نیا دور کے وجاہت علی سندیلوی نمبر میں ایک مضمون شامل ہے۔

ہاں تو جب نیا دور کے مذکورہ شمارے ہاتھ آئے تو ان پر اپنی رائے ظاہر کرنے کی فرمائش بھی کی گئی۔ یوں تو میں خود کو اس قابل نہیں پاتا ہوں کہ ان پر کسی طرح کی تنقید یا تنقیص کروں البتہ محنت اور کوشش کی ستائش نہ کرنا بھی ایک نوع کی ناانصافی ہوگی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ نیا دور جب سے میرے مطالعہ میں آیا میں نے اسے ایک ہی نہج پر چھپتے ہوئے پایا، خواہ مضامین ہوں یا اس کی ظاہری تزئین و آرائش جو مال جہاں سے آیا دوکان کے شوکیس میں سجا دیا۔ خریداروں کے ذوق وشوق اور ان کی پسند کو کبھی خاطر نہیں لانہیں گیا۔ مال فروخت ہوگیا تو ٹھیک ورنہ سرکاری بہی کھاتے میں۔

مجھے اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ نیا دور میں تخلیقات کے تنوع کی اسی کمی نے مجھے کبھی کبھی بیزار بھی کیا۔ لیکن اب جب ان تینوں شماروں پر جستہ جستہ نظر دوڑائی تو معاملہ قدرے مختلف نظر آیا۔ مشمولات اس امر کی غمازی کر رہے ہیں کہ ایڈیٹر اس کے معیار و پیشکش میں تبدیلی لانے کے لئے نہ صرف کوشاں ہیں بلکہ ان کے اندر ذوق و جستجو کا جو جذبہ کارفرما ہے وہ انہیں معیاری تخلیقات حاصل کرنے کے لئے مسلسل مہمیز کر رہا ہے۔ یہ ایڈیٹر کی تگ و دو کا نتیجہ ہے کہ نیا دور کے تینوں شماروں میں ایک تنوع نظر آرہا ہے جو ہر تخلیق کو ذوق وشوق سے پڑھنے کے لئے مصر کر رہا ہے۔ میرے خیال میں نیا دور کے لئے فال نیک ہے۔ خدا کرے خوب سے خوب تر کی تلاش کا یہ سلسلہ چلتا رہے۔

آپ نے نیا دور کے ہر شمارے میں دو کہانیوں کے تراجم شائع کرنے کی بات کہی جو نظر بھی آرہی ہے۔ جن میں ایک کہانی تو ہندی ادب سے مستعار لی جائے گی اور ایک کسی دوسری زبان سے۔ یہ سلسلہ اچھا ہے۔ مگر میری ناقص رائے یہ ہے کہ اس سلسلہ کو صرف ایک کہانی تک محدود رکھا جائے۔ ہر شمارہ میں صرف ایک کہانی کا ترجمہ ہو کبھی ہندی کبھی دیگر زبان کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے اردو کہانیوں کی اشاعت کے دائرہ پر زیادہ فرق نہیں پڑے گا اور قاری کو غیر اردو کہانی پڑھنے میں کوئی اکتاہٹ بھی نہیں ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر مضمون یا کہانی کے صفحہ پر باکس میں اس صفحہ کی عبارت کا چیدہ اقتباس مکرر شائع کیا جا رہا ہے۔

میری نظر میں یہ جگہ کا زیاں ہے کیونکہ جو عبارت ہم باکس میں پڑھ رہے ہیں، اپنے پورے سیاق وسباق کے ساتھ مضمون کے صفحہ میں شامل ہے۔ پورے شمارے میں باکس کی جگہ کو اگر ایک جگہ سمیٹا جائے تو میرے خیال میں مزید ایک مضمون شائع کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ اگر کسی مضمون یا کہانی کے شروعاتی صفحہ پر تخلیق یا اس کے مصنف کے بارے میں بطور تعارف کچھ سطریں باکس میں تحریر کر دی جائیں تو اچھا رہے گا لیکن یہ کام تھوڑا محنت طلب ہے۔

تو صاحب! نیا دور کو جس نیک نیتی، خلوص اور محنت و کاوش کے ساتھ نئے دور میں داخل کرانے کا جو بیڑہ آپ نے اٹھایا ہے اس کے لئے آپ کی ذات گرامی قابل مبارکباد ہے۔

'اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے'

محمد حنیف (محلہ منڈی، سنڈیلہ)

اکتوبر کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق دیکھ کر دل شاد ہوا۔ صمیم قلب سے آپ کی صحت و سلامتی کی دعائیں نکلیں۔ خدا آپ کو شاد و آباد رکھے۔ کیا عمدہ رسالہ شائع کیا ہے۔ غالباً سرکاری محکمہ سے پہلی مرتبہ محرم اور عزاداری کے موضوع پر کچھ مواد منظر عام پر آیا ہے۔

نوحے، سلام، مرثئے، عمدہ مضامین، غرض کہ کیا نہیں ہے جس کی شکایت کی جائے۔ لکھنؤ کی تاریخی عزاداری پر مرزا جعفر حسین کا بیش قیمتی مضمون پہلی مرتبہ نظر سے گزرا گویا بزرگوں کی زبانی سنا ہوا قدیم لکھنؤ نگاہ کے سامنے آ گیا۔ بہادر شاہ ظفر، میر تقی میر، غالب وغیرہ کے مراثی اور سلام سے پہلی مرتبہ آشنائی ہوئی۔ 'آخری شمع' لاجواب ہے۔ تعجب ہوتا ہے وہ کون سی روح تھی تو وقت تحریر عصمت کے جسم میں سما گئی تھی۔ تاریخ کو ادبی پیرائے میں عمدہ طریقہ سے پیش کرنے کا ہنر کوئی عصمت سے سیکھے۔

ایک جانب توجہ دلانا مقصود ہے اور وہ یہ کہ جیسے نیا دور نے حسینیہ غفرانمآب کی بہترین تاریخ سے قارئین کو آشنا کرایا ہے، اسی طرح چند دیگر عظیم اہمیت کی حامل امامبارگاہوں کی تاریخی پر بھی کافی کچھ لکھا جا سکتا تھا۔ رسالہ قابل تحسین ہے اور آپ کیلئے سرمایۂ آخرت ثابت ہوگا انشاءاللہ۔

سید محمد سرور رضوی (سرفراز گنج، لکھنؤ)

ماہنامہ 'نیا دور' کے ستمبر ۲۰۱۷ء کے شمارہ کی رسم اجراء کے بعد ورق گردانی کرتے ہوئے اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک
دائیں جانب ہیں پرنسپل سکریٹری اطلاعات جناب اونیش کمار اوستھی اور بائیں جانب پرنسپل سکریٹری گورنر محترمہ جوتھیکا پاٹنکر

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک نے ۲۲ ستمبر کو راج بھون، لکھنؤ میں ماہنامہ 'نیا دور' کے ستمبر ۲۰۱۷ء کے شمارہ کا رسم اجراء کیا۔
صبا عرفی، سلیم احمد، ایڈیٹر نیا دور سہیل وحید، اونیش کمار اوستھی، (دائیں) پرنسپل سکریٹری گورنر محترمہ جوتھیکا پاٹنکر، سکریٹری جناب چندر پرکاش، انجم عباس نقوی، رفعت نعیم صفوی، شاہد کمال (بائیں)

لکھنؤ کی عزاداری پر اکتوبر ۲۰۱۷ء کا خصوصی شمارہ مشہور شیعہ عالم دین مولانا سید کلب جواد نقوی کو پیش کرتے ہوئے 'نیا دور' کے ایڈیٹر سہیل وحید

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی صدر جمہوریۂ ہند جناب رام ناتھ کووند کو لکھنؤ کے اندرا گاندھی پرتشٹھان میں منعقد استقبالیہ تقریب میں کتاب پیش کرتے ہوئے۔
ساتھ میں ہیں اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور ودھان سبھا کے اسپیکر جناب ہردے نارائن دیکشت (۱۴ر ستمبر ۲۰۱۷ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی ایودھیا میں
وزیر اعظم رہائشی اسکیم (شہری) کے مستفیدین کو سرٹیفکٹ دیتے ہوئے (۱۸ر اکتوبر ۲۰۱۷ء)

वर्ष : 72 अंक 08
नवम्बर 2017
मूल्य : 10 रु./–
वार्षिक मूल्य : 110 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, अनुज कुमार झा, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, सुहेल वहीद